مخدوم علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی
الغزنوی ثم الہجویری المعروف بہ

داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ
اور
اُن کا عہد

٭

خالد محمود

٭

مقبول اکیڈمی، ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی، لاہور

اہتمام : ملک مقبول احمد

طبع اوّل ۱۹۷۵ء

مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس۔ لاہور

قیمت : اٹھارہ روپے

مقبول اکیڈمی، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی لاہور

انتساب

حضرت داتا گنج بخش

رحمتہ اللہ علیہ

کے نام

جن کا چشمہ فیض

آج بھی جاری ہے

مندرجات

سیّدِ ہجویرؒ

سیّد ہجویر مخدومِ امم
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم

بندہائے کوہسار آساں گسیخت
در زمینِ ہند تخمِ سجدہ ریخت

عہدِ فاروقؓ از جمالش تازہ شُد
حق ز حرفِ او بلند آوازہ شُد

پاسبانِ عزتِ امّ الکتاب
از نگاہش خانۂ باطل خراب

خاکِ پنجاب از دمِ او زندہ گشت
صبحِ ما از مہرِ او تابندہ گشت

عاشق و ہم قاصدِ طیارِ عشق
از جبینش آشکارا اسرارِ عشق

علامہ محمّد اقبالؒ

مقدمہ

پانچویں صدی ہجری کو مشرقی دُنیائے اسلام کی سیاسی، عسکری، تہذیبی اور فکری تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ زمانہ ـــــ کشور کشاؤں میں محمُود غزنوی اور الپ ارسلان کا، شعر و سُخن میں فردوسی، عنصری اور عمر خیام کا، تاریخ نگاری میں عتبی اور بیہقی کا، سیاست اور جہانبانی میں کیکاؤس اور نظام الملک طوسی کا صُوفیوں میں ہمارے داتا صاحب ـــــ حضرت ابوالحسن علی بن عثمان الہجویریؒ کا زمانہ تھا۔

اس زمانہ میں مُسلمانوں کی سلطنت بحرِ اوقیانوس سے بحرِ ہند تک، تین برِ اعظموں میں کرہ ارض کے کم و بیش ایک تہائی عرض پر محیط تھی۔ تاہم اس میں مرکزیت کا وجُود باقی نہ تھا۔ مغرب میں ہسپانیہ کی آزاد ریاست تھی۔ مصر کے علاوہ شام اور عراق کے کچھ حصّوں پر فاطمیوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی مشرقی عراق اور جنوب مغربی ایران پر سلاطینِ بویہ کو تسلط حاصل تھا بلکہ اس صدی کے نصف اوّل تک انہیں خلیفہ بغداد پر بھی بالادستی حاصل تھی۔ غزنویوں نے خراسان، افغانستان اور شمالی ہندوستان پر مشتمل ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی۔ اس صدی کے نصف آخر میں خراسان میں ایک نئی قوت سلجوقی اُبھرے اور غزنویوں کو صرف افغانستان اور شمالی ہندوستان پر قناعت کرنا پڑی۔ پوری اسلامی دنیا کا مغربی حِصّہ تو پہلے ہی خلفائے بغداد کے دائرہ اثر سے باہر تھا لیکن مشرقی حِصّہ میں بھی اُن کا نام فقط خُطبوں اور سرکاری دستاویزات میں ہی باقی رہ گیا تھا۔ خلفائے بغداد مشرق کے ان خود مختار حکمرانوں پر حکم چلانے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اُن کے پاس اپنی بات منوانے کے لئے رائے عامہ کے دباؤ کے سوا کوئی ذریعہ باقی نہ تھا۔ بہرکیف وہ رائے عامہ کو اپنے حق میں استعمال کرنے کا فن خُوب جانتے تھے مثلاً جب محمود غزنوی نے سمرقند کو اپنی قلمرو میں شامل کرنا چاہا تو خلیفہ القادر باللہ نے کہلا بھیجا "اگر میری مرضی کے خلاف سمرقند کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھو گے تو میں ساری دُنیا کو تمہارے خلاف ابھار دوں گا۔"

محمود غزنوی یہ دھمکی سُن کر سیخ پا ہو گیا۔ اس نے بڑے غصّہ کے ساتھ خلیفہ کے سفیر کو جواب دیا "اچھا! آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں ہزار ہا کوہ پیکر ہاتھیوں سے بغداد کو روند ڈالوں اور بارگاہِ خلافت کا ملبہ تک ہاتھیوں پہ لاد کر غزنی لے آؤں؟" خلیفہ بغداد نے اس کے جواب میں سورہ فیل لکھ بھیجی۔ محمود اس کا مفہوم جان کر آبدیدہ ہو گیا۔ اگرچہ محمود غزنوی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی پوری قوت رکھتا تھا مگر رائے عامہ کو اپنے خلاف نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بغداد نے غزنین پر نفسیاتی فتح حاصل کر لی۔

مصر میں فاطمی خلفا کے عروج کا زمانہ عراق میں عباسی خلفا کے زوال کا زمانہ تھا۔ ہمارے زیرِ نظر زمانہ میں شیعہ سنی اختلاف محض عقائد کا اختلاف نہ رہا تھا بلکہ سیاسی اختلاف بھی بن گیا تھا۔ مصر کے خلفا شیعہ عقائد کے اور بغداد کے خلفا سنی عقائد کے "محافظ" بن گئے تھے۔ فاطمیوں کے زیرِ اثر علاقوں میں سنیوں کی اور عباسیوں کے زیرِ اثر علاقوں میں فاطمیوں اور ان کے خیر خواہ قرامطیوں اور اسمٰعیلیوں کی تطہیر کا سلسلہ مذہبی سے زیادہ سیاسی وجوہ کی بنا پر جاری تھا۔ مثلاً محمود غزنوی کا وزیر ابوعلی حسن بن محمد المعروف بہ حسنک ۴۱۴ھ / ۱۰۲۳ء میں حج سے واپس آ رہا تھا تو نجد کے غیر یقینی حالات کے باعث فلسطین اور شام کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ علاقے فاطمیوں کے زیرِ اثر تھے۔ فاطمی خلیفہ الظاہر نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حسنک کو خلعت سے نوازا اور اس کے ہاتھ محمود غزنوی کے لئے دوستی کا پیغام ارسال کیا۔ اس واقعہ نے خلیفہ بغداد القادر کو لوکھلا دیا۔ اس نے الزام لگایا کہ حسنک قرامطی ہو گیا ہے اور محمود سے مطالبہ کیا کہ اسے پھانسی پہ لٹکا دیا جائے۔ محمود غزنوی یہ الزام اور مطالبہ سُن کر برہم ہو گیا۔ اس نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا: "اس بڈھے خلیفہ کو لکھو کہ عباسیوں کی خیر خواہی میں ساری دنیا سے نبرد آزما ہوں اور قرامطیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹھکانے لگا رہا ہوں۔ اگر یہ بات ثابت ہو جاتی کہ حسنک قرامطی ہے تو خلیفہ کو پتہ چل جاتا کہ اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔ میں نے اسے پالا پوسا ہے۔ وہ میرے بیٹوں اور بھائیوں جیسا ہے۔ اگر وہ قرامطی ہے تو میں بھی ہوں۔" اس جواب کے ساتھ وہ خلعت بھی بغداد روانہ کر دی جو الظاہر نے حسنک کو دی تھی تاکہ خلیفہ اسے نذرِ آتش کر دے۔ اس واقعہ کے سولہ سترہ برس بعد سلطان مسعود نے ذاتی عداوت کے باعث حسنک کو قرامطی قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہ تعصب صرف سنیوں میں شیعوں کے خلاف یا شیعوں میں سنیوں کے خلاف ہی نہ تھا بلکہ خود

اہلِ سنت بھی بیسیوں فرقوں میں بٹے ہوتے تھے اور آپس میں دست بہ گریبان تھے۔ خراسان اور ماوراءالنہر میں حنفیوں کا بڑا زور تھا۔ غزنویوں کی سرپرستی سے اس مکتبِ فکر کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ قبولِ عام میں دوسرا درجہ شافعیوں کو حاصل تھا۔ حنبلیوں اور مالکیوں کی تعداد بھی قابلِ لحاظ تھی۔ تاہم سنیوں کی فکری تقسیم انہی چار مکاتب فکر پر ختم نہ ہوگئی تھی بلکہ ان میں سے ہر فرقہ کئی ذیلی فرقوں میں بٹا ہوا تھا۔ مقدسی نے "احسن التقاسیم" میں اس عہد کے فرقوں اور ان کے تعصبات کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بڑی ہولناک ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس وقت شیعوں کے فرقے یہ تھے۔ معتزلہ، اسمٰعیلی، فاطمی، قرامطی اور زیدی وغیرہ۔ خارجیوں کے دو فرقے تھے۔ شراۃ اور نجدہ۔ شافعیوں میں اہلیہ، صدقیہ اور سالمیہ۔ حنبلیوں میں بربہاری۔ حنفیوں میں زعفرانی، سکی، عروسی، نجاری اور کرامی فرقے تھے۔ ان کے علاوہ داؤدی، اشعری، فضلی اور عملی فرقے بھی تھے۔ مقدسی نے صوفیوں کو الگ فرقہ قرار دیا ہے لیکن نام صرف ایک حبّیہ کا لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے: "ان فرقوں کے باہمی لڑائی جھگڑے دیکھ کر دل پارہ ہوتا ہے۔" کشف المحجوب کا مقصد مسلمانوں کے تفرقہ پر روشنی ڈالنا نہیں تاہم صوفیانہ مباحث میں بعض فرقوں کے خیالات زیرِ بحث آگئے ہیں ان میں اہلِ سنت کے چار مکاتبِ فکر کے علاوہ حشویہ، متکلمین، مرجیہ، قدریہ، جبریہ، معتزلہ، مشبہین، قرمطی، باطنی، شیعہ، خارجی اور دہریہ شامل ہیں۔ داتا صاحب نے صوفیوں کے بھی بارہ فرقے گنواتے ہیں جن میں سے دس فرقوں یعنی نوری، محاسبی، قصاری، طیفوری، جنیدی، سہیلی، حکیمی، خرازی، خفیفی اور سیاری کو مقبول اور دو فرقوں — حلولی اور حلاجی کو مردود قرار دیا ہے۔ (3)

اس زمانہ میں "تقلید" کا چلن عام تھا۔ اہلِ سنت کے چاروں مکاتبِ فکر ایک دوسرے سے دست بہ گریباں ہونے کے باوجود ان چاروں میں سے کسی ایک کی تقلید لازمی قرار دیتے تھے۔ پابندِ شریعت صوفیوں کے مختلف فرقے بھی ان میں سے کسی نہ کسی مکتبِ فکر سے منسلک تھے تاہم یہ صوفیا اپنے زمانہ کے علماء، خطبا اور مناظرین کی طرح دوسرے مکاتبِ فکر کی مذمت نہ کرتے تھے۔ شیخ ابوسعیدؒ بن ابی الخیر المیہنی شافعی تھے اور ہمارے داتا صاحب حنفی تھے۔ اس کے باوجود آپ شیخ ابوسعید سے بڑی ارادت رکھتے تھے۔ داتا صاحب نے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالک اور امام احمد حنبل کو تابعین میں صوفیا کے اماموں میں شامل کیا ہے اور چاروں کا ذکر بڑی محبت اور

یکساں عقیدت سے کیا ہے۔ داتا صاحب نے حضرت بایزید بسطامیؒ کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے
کہ "خالص توحید الٰہی کے سوا سب امور میں علما کا اختلاف رحمت ہے۔"
داتا صاحب نے اپنے زمانے کی بدبختی یہ بتاتی ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے چند خاص بندوں کے
سوا باقی سب لوگوں نے اسلام کی حقیقت کو چھوڑ کر صرف عبارت پر اکتفا کر لی ہے اور کام
تحقیق سے نکل کر تقلید میں پڑ گیا ہے۔" داتا صاحب اپنے مریدوں کو تقلید سے بچنے اور تحقیق کو اپنانے
کی تاکید فرماتے ہیں۔ اپنے استاد حضرت اشقانیؒ کے تذکرہ میں مریدوں پر واضح کرتے ہیں کہ "تقلید تو
معنی میں بھی اچھی نہیں ہوتی لہٰذا عبارت میں تقلید کیسے درست ہو سکتی ہے؟" شیخ احمد بخاریؒ سے
ملاقات کا ماحصل یہ قرار دیا ہے کہ "مخلوق میں سے کسی کی تقلید نہ کی جائے" (داتا صاحب نے تقلید کو
علما کا اور تحقیق کو صوفیا کا چلن قرار دیا ہے اور خود کو جگہ جگہ محقق لکھا ہے۔ کشف المحجوب میں اس
تحقیقی ذوق کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ داتا صاحب نے شیخ ابو عبدالرحمٰن السلمیؒ کا ذکر بڑے احترام
سے کیا ہے اور ان کی کئی تصانیف کے حوالے بھی دیتے ہیں مگر جہاں کہیں کوئی بات کھٹکی ہے وہاں
اپنی اختلافی رائے برملا ظاہر کر دی ہے۔ مثلاً یہ کہ "السلمی نے مسطح بن اثاثہ بن عباد کو بھی اصحاب صُفّہ
میں شامل کیا ہے لیکن میں دل سے اسے دوست نہیں رکھتا کیونکہ ام المومنین حضرت عائشہؓ پر تہمت
کی ابتدا اسی مسطح نے کی تھی۔" داتا صاحب کے محققانہ رویے کا نقطہ عروج یہ ہے کہ اپنے مرشدوں کے
مرشد حضرت جنیدؒ پر بھی تنقید سے گریز نہیں کیا۔ انہوں نے نیند کے بارے میں حضرت جنیدؒ کا یہ
قول نقل کیا ہے کہ "نیند محبان الٰہی پر خدا کی بخشش ہے۔" داتا صاحب اس پر لکھتے ہیں "تعجب ہے کہ
حضرت جنید تو صاحب صحو مرد تھے مگر یہاں سکر کی تعریف فرما رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ
بات حال کے غلبہ میں کہی ہو۔" صوفیا میں اس تحقیقی روش کی انتہا داتا صاحب کے خورد معاصر الغزالیؒ کے
یہاں ملتی ہے جو داتا صاحب کے ایک استاد حضرت ابو القاسم گرگانیؒ کے مرید شیخ ابو علی فارمدیؒ
کے شاگرد تھے۔ غزالی سے پوچھا گیا "آپ مذہب میں کس کے مقلد ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "عقلیات
میں عقل کا، منقولات میں قرآن مجید کا اور آئمہ میں سے کسی کا بھی مقلد نہیں ہوں۔")
محمود غزنوی نے ہندوستان کی سرزمین کو تو فتح کر لیا تھا مگر اس عمل کے دوران البیرونی کے بقول
ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت پیدا کر دی تھی۔ جب تک نفرت کی یہ دیوار

نہ دی جاتی تب تک اہلِ ہند کے دل فتح نہیں کیے جا سکتے تھے۔ جو کام ایک سلطان اپنے لاؤ لشکر سے نہ کر سکا تھا وہ ایک ایسے فقیر نے انجام دیا جو صرف ایک گدڑی، ایک مصلّے، ایک لوٹا اور ایک چھڑی کی متاع لے کر لاہور آیا تھا۔ یہ درویش ہمارے داتا صاحب تھے۔ انہوں نے یہ کارنامہ کسی قسم کی سرکاری سرپرستی کے بغیر انجام دیا۔ انہیں بادشاہوں اور امرا سے جو نفرت تھی اس کا اظہار کشف المحجوب میں کئی جگہوں پر ہوا ہے۔ اس نفرت کا سبب یہ تھا کہ امرا عوام کو لوٹتے تھے اور اسلامی احکام سے روگردان تھے۔ لہٰذا داتا صاحب نے اپنے مریدوں کو امرا سے راہ و رسم رکھنے کی بڑی سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے۔

داتا صاحب کی شخصیت اور ان کے مشن کو اس عہد کے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر میں ہی پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس تناظر میں اس مسلم انقلابی کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ اس قدر دلکش ہے کہ بے اختیار ان کے قدموں سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔ اسے ہماری بدنصیبی کہہ لیجئے کہ داتا صاحب کے سوانحی حالات کسی ذریعہ سے بھی معلوم نہیں ہوتے۔ سوانح نگاروں کو اس مقصد کے لئے صرف کشف المحجوب پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اکثر مباحث میں کشف المحجوب کے اقتباسات کی تکرار سے مفر نہ تھا۔

میں نے عام رواج کے مطابق مآخذ کے حوالے ہر صفحہ پر دینے کے بجائے کتاب کے آخر میں یکجا کر دیئے ہیں۔ ہر صفحہ پر انگریزی میں جو نمبر دیئے گئے ہیں وہ اس صفحہ کی نشاندہی کرتے ہیں جس پر مآخذ بیان کئے ہیں اس سے سنجیدہ قارئین کو تو ضرور الجھن ہوگی مگر عام قارئین کو بڑی سہولت رہے گی۔

آخر میں ایک ایسے مہربان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کے مخلصانہ تعاون کے بغیر یہ کتاب تکمیل کو نہ پہنچ سکتی تھی۔ عزیزم عبدالوہاب خان سلیم کے ترک وطن کے بعد مجھے امید نہ تھی کہ اس تالیف کے لئے درکار کتب اور جرائد جمع کر سکوں گا مگر محترم مصباح الحق صدیقی، لائبریرین دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور نے جس فراخدلی سے اپنے خزانے میرے حوالے کر دیئے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔

خالد محمود

۱۲۲ بی نیو سمن آباد، لاہور

باب ۱

حیات وصفات

****

حضرت داتا صاحبؒ کی صحیح تاریخ ولادت کسی مستند ذریعہ سے معلوم نہیں ہوسکی۔ تاہم زمانہ حال کے بعض سوانح نگاروں نے آپ کا سالِ ولادت ۴۰۰ھ/۱۰-۱۰۰۹ء لکھا ہے[۱]۔ داتا صاحب کے سوانح نگاروں کا سب سے پرانا ماخذ "نفحات الانس" مرتبہ نورالدین جامیؒ ہے جو ۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء میں مکمل ہوا۔ اس میں داتا صاحبؒ کے سالِ ولادت کی کوئی تصریح نہیں کی گئی[۲]۔ آئین اکبری (۱۰۰۲ھ/۱۵۹۳ء) میں بھی سالِ ولادت درج نہیں[۳] آئین اکبری کے ۵ سال بعد مرتب ہونے والے "تذکرۃ الاولیاء "ثمرات القدس" مؤلفہ لعل بیگ بخشی میں بھی تاریخ پیدائش درج نہیں[۴]۔ شہزادہ داراشکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" میں بزرگانِ دین کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں درج کرنے کا بڑا خیال رکھا ہے لیکن داتا صاحب کی تاریخ ولادت کے ضمن میں اس نے بھی سکوت اختیار کیا ہے[۵]۔

اِن حقائق کے پیشِ نظر یہ کہنا صحت سے بعید ہے کہ آپ ۴۰۰ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ داتا صاحب ۴۰۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔ مولوی محمد شفیع مرحوم کے نزدیک داتا صاحب کی "ولادت چوتھی صدی ہجری کے اواخر، یا پانچویں کے ابتدا میں ہوئی ہوگی"[۶]۔ الغرض جب تک کوئی ٹھوس ثبوت

دستیاب نہیں ہوتا تب تک داتا صاحب کی تاریخ ولادت کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

مولد

حضرت داتا صاحب کا مولد غزنی ہے جو اس زمانے میں دریا کے دونوں کناروں پر پھیلے ہونے کے باعث غزنین (دو غزنی) کہلاتا تھا[8]۔ داتا صاحب نے کشف المحجوب کے آغاز میں اپنا نام یوں لکھا ہے:

"علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی الغزنوی ثم الہجویریؒ"

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کی ولادت جلاب (غزنی) میں ہوئی اور پھر ہجویر میں منتقل ہو گئے۔ دارا شکوہ نے وضاحت کی ہے کہ "جلاب اور ہجویر غزنی کے دو محلے تھے[9]"۔

خاندان

حضرت داتا صاحبؒ کا شجرہ نسب بھی ان کے دادا سے آگے صحت کیساتھ معلوم نہیں۔ پرانے تذکروں میں کچھ نہیں لکھا۔ دارا شکوہ نے ذاتی تحقیقات سے ہماری معلومات میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ ان کے ماموں جان کا لقب تاج الاولیاء تھا، اور یہ کہ سارا خاندان زہد و تقویٰ کے لئے مشہور ہے[10]۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں لکھا۔

ایک صدی پہلے نور احمد چشتی نے مجاوروں کی زبانی شجرہ نسب یوں لکھا ہے:

"حضرت علی گنج بخش بن سید عثمان بن سید علی بن سید عبدالرحمٰن بن سید عبداللہ ہجویری بن سید ابوالحسن علی بن سید حسن بن سید زید شہید بن حضرت امام حسن بن علی المرتضیٰ[11]"

اس طرح آپ کا شجرہ نسب نویں پشت میں حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے ــــ زمانۂ حال کے تذکرہ نگاروں میں سے بعض نے سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے حضرت علیؓ پر ختم کیا ہے اور بعض بزرگوں کے ناموں میں بھی اختلاف کیا ہے۔[12]

روحانی نسبت

حضرت داتا صاحبؒ امام اعظمؒ کے معتقد تھے۔ ان کے مرشد شیخ ابوالفضل محمد ابن حسن الختلیؒ تھے جن کے مرشد شیخ ابوالحسن الحصریؒ تھے اور ان کے مرشد شیخ شبلیؒ تھے اور وہ ابوالقاسم جنیدؒ بغدادی کے مرید تھے۔ یوں داتا صاحب کا حسب نامہ بھی حضرت علیؓ پر منتہی ہوتا ہے۔[13] تاہم "کشف المحجوب" میں انہوں نے پہلے چاروں خلفا رضی اللہ عنہم کو طریقت کا امام بتایا ہے۔

"کشف المحجوب" کے ساتویں باب "فی ذکر ائمتھم من الصحابۃ رضی اللہ عنھم" کا آغاز حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کیا ہے اور سب سے زیادہ تفصیلی تذکرہ حضرت صدیق اکبرؓ کا کیا ہے۔ کلام کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے کہ:

"وہ تمام مسلمانوں کے عموماً اور اہلِ طریقت کے خصوصاً امام ہیں۔"[14]

حضرت عمرؓ فاروق کے بارے میں لکھتے ہیں:

"طائفہ صوفیا گدڑی پہننے اور دین میں سختی کے بارے میں آپ ہی کی اقتداء کرتا ہے۔"[15]

حضرت عثمانؓ کے ذکر میں لکھا ہے:

"صوفیا مال و جان کی قربانی، تسلیم و رضا اور عبادت کے اخلاص میں آپ ہی کی اقتدا کرتے ہیں اور در اصل

حقیقت اور شریعت میں سب کے امام حق ہیں۔[16]

حضرت علی کرم اللہ تعالےٰ وجہہٗ کے بیان میں فرماتے ہیں :

"طریقت میں آپ کی شان بڑی عظیم اور رتبہ بہت بلند ہے۔۔۔۔ اہلِ طریقت، عبارتوں میں پوشیدہ حقیقتوں اور اشاروں کے دقائق کو سمجھنے، دنیا اور آخرت سے علیحدگی اور تقدیرِ حق پر نظر رکھنے میں آپ ہی کی اقتداء کرتے ہیں۔"[17]

تعلیم و تربیّت

حضرت داتا صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی؟ قدیم و جدید تذکرے اس سلسلہ میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتے۔ البتہ ثانوی تعلیم و تربیت کے بارے میں کشف المحجوب سے کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دارا شکوہ ہمیں بتا چکا ہے کہ داتا صاحب کا سارا گھرانہ علم کی دولت سے مالا مال تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے علم پرور گھرانے کے کسی ذہین و فطین فرزند کو ابتدائی تعلیم و تربیت کے لیئے اپنے گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھنے کی ضرورت پیش نہ آئی ہوگی۔

"کشف الاسرار" نام کا ایک مختصر رسالہ حضرت داتا صاحب سے منسوب ہے، اور یہ نسبت ہنوز ثبوت طلب ہے۔ تاہم اس میں ایک جگہ لکھا ہے کہ انہوں نے شیخ بزرگ کی فرمائش پر بارہ سال کی عمر میں ایک کتاب لکھی تھی۔[18] اگر اس مشکوک رسالہ۔۔۔ "کشف الاسرار" کی شہادت قبول نہ کی جائے تب بھی یہ امر مسلمہ ہے کہ داتا صاحب نے نوجوانی کے عالم میں ہی تصنیف و تالیف کا شغل اختیار کر لیا تھا۔ "کشف المحجوب" کی ایک عبارت سے اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

"کشف المحجوب" اخیر عمر کی تصنیف ہے۔ اس میں کئی جگہ تصنیف و تالیف کے ضمن میں اوائل عمر کے جوش و خروش اور خام خیالی پر معذرت خواہ دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً پانچویں باب " اختلافهم فی الفقر والصفوة " میں فنا و بقا کے مسئلہ پر علماء کی موشگافیوں کو بے معنی عبارت آرائی اور ارباب لسان کی فضول باتیں قرار دے کر اقرار کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ایک کتاب "فنا و بقا" میں بچپن کے خبط اور احوال کی تیزی کے باعث اس انداز سے کچھ لکھا ہے لیکن اب اس کتاب (کشف المحجوب) میں پوری احتیاط سے اس کے احکام بیان کریں گے"۔[19]

اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ داتا صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسقدر جامع اور ہمہ گیر تھی کہ بچپن میں ہی "فنا و بقا" جیسے پیچیدہ مسائل پر قلم اٹھانے لگے تھے

ماہر علوم

"کشف المحجوب" کے سرسری مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ حضرت داتا صاحب، قرآن، حدیث اور تفسیر میں درجہ کمال رکھتے تھے۔ شعر و ادب میں ان کے کمال کا ثبوت ان کا دیوان ہے جسے کسی بدبخت نے چرالیا تھا۔[20] داتا صاحبؒ نے دسواں پردہ کھولتے ہوئے مختلف علوم کی اصطلاحوں پر جو بحث کی ہے اس سے داتا صاحب کی ہمہ دانی کا اشارہ ملتا ہے۔ لکھتے ہیں :

> " بعض اصطلاحات اہل لغت نے اپنے لئے مخصوص کرلی ہیں جیسے فعل ماضی۔ فعل مستقبل، صحیح اور معتل، اجوف و لفیف اور ناقص وغیرہ۔ اہل نحو کی اپنی مخصوص اصطلاحیں ہیں ــــ جیسے رفع و ضم۔ نصب و فتح۔ خفض و کسر۔ جزم و جر۔ اور منصرف و نامنصرف وغیرہ۔ اہل عروض کی بھی اپنی اصطلاحیں ہیں؛ جیسے

بحور و دوائر، سبب وتد اور فاصلہ وغیرہ۔ حساب دانوں نے
اپنی اصطلاحیں مخصوص کر رکھی ہیں جیسے فرد و زوج۔ ضرب و تقسیم
کعب و جذر۔ اضافت۔ تضعیف و تنصیف اور جمع تفریق
وغیرہ۔ اہلِ فقہ نے بھی بعض اصطلاحیں خود سے مخصوص کر لی ہیں،
جیسے علت و معلول۔ قیاس و اجتہاد۔ دفع و الزام وغیرہ،
محدّثوں کی بھی مخصوص اصطلاحیں ہیں جیسے مسند و مرسل۔ احاد و
متواتر۔ جرح و تعدیل وغیرہ۔ متکلمان نے بھی بعض اصطلاحیں
مخصوص کر رکھی ہیں۔ مثلاً عرض و جوہر۔ کل و جزو۔ جسم و حدث
اور تجزیہ و توالی وغیرہ۔"[21]

اسی طرح کشف کی بعض عبارتوں سے علم طب اور کیمیا میں بھی درک رکھنے کے اشارے ملتے ہیں[22]۔ داتا صاحب علوم کے تمام سمندروں کی غواصی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے جو مرید کو بتایا:

"جان لو کہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر کم ہے۔ اس لئے تمام
علوم و فنون کا سیکھنا لوگوں پر فرض نہیں۔ مثلاً نجوم و طب۔ علم
حساب اور علم بدیع کے صنائع وغیرہ، تاہم ان میں سے ہر علم
میں اتنا درک ہونا ضروری ہے کہ شریعت کے تقاضے کماحقہٗ
پورے کئے جا سکیں یعنی علوم نجوم کا اتنا سیکھنا ہی کافی ہے۔ کہ
رات کو وقت شناخت کر سکے۔ طب کی اتنی ہی ضرورت ہے، کہ
نقصان سے بچ سکے۔ حساب اتنا ہی سیکھنا کافی ہے کہ وراثت
کے مسائل کو سمجھ سکے اور مدتِ عدت کا حساب لگا سکے۔ غرضیکہ
علم کا سیکھنا اسی قدر فرض ہے کہ بندہ اپنے اعمال درست

رکھ سکے "[۴۳]

تصوّف کی راہ پر

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ داتا صاحبؒ نے ابتدائے تعلیم سے انتہائے علم تک، عالم سے محقق بننے تک اور تحقیق سے تصوّف تک کے فاصلے کب اور کیسے طے کئے؟ — بہرحال کشف المحجوب میں ڈوب کر بعض ایسے اشارات تلاش کئے جاسکتے ہیں جن کے سہارے یہ مفروضہ قائم ہو سکتا ہے کہ داتا صاحب نے ایک عام دنیادار سے مرجع خلائق صوفی بننے تک کے مراحل یک بیک طے نہیں کر لئے تھے، بلکہ جملہ دنیاوی تجربات سے گزرنے کے بعد ہی دنیاداری سے توبہ کرکے تصوف کی طرف مائل ہوئے ہوئے تھے۔ دنیاداری کو ترک کرکے توبہ کرنے کا ذکر "کشف المحجوب" کے چودھویں باب میں آیا ہے جہاں آپ نے کرامت کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنا ایک ذاتی واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ اوزکند سے فرغانہ کے گاؤں شلاتک میں ایک بزرگ باب عمر کی زیارت کو گئے جو اوتاد کے مرتبہ پر فائز تھے۔ اس علاقہ میں بزرگ درویشوں اور مشائخ کو باب کہتے تھے۔ وہاں پہنچے تو باب عمر نے پوچھا:

"اے بچے! کس لئے آئے ہو؟"

داتا صاحب نے جواب دیا: "حضور کو بچشم خود دیکھنے اور نظرِ کرم کی امید لیکر آیا ہوں۔"

باب عمر نے کہا: "مَیں تو تمھیں فلاں دن سے خود دیکھ رہا ہوں اور جب تک کوئی تجھے مجھ سے غائب نہ کردے تب تک تجھے دیکھتا ہی رہوں گا۔"

داتا صاحب لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے روز و سال کا حساب لگایا تو یہ انکشاف ہوا کہ باب عمر نے جس دن سے انہیں دیکھنے کا بتایا تھا وہ دن ان کی توبہ کا روزِ اول تھا[۴۴]۔ اس بات کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ داتا صاحب کی زندگی کا یہ مبارک دَور کب شروع ہوا تھا

رکھ سکے"۔[۴۳]

تصوّف کی راہ پر

ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ داتا صاحبؒ نے ابتدائے تعلیم سے انتہائے علم تک، عالم سے محقق بننے تک اور تحقیق سے تصوّف تک کے فاصلے کب اور کیسے طے کئے؟ — بہرحال کشف المحجوب میں ڈوب کر بعض ایسے اشارات تلاش کئے جا سکتے ہیں جن کے سہارے یہ مفروضہ قائم ہو سکتا ہے کہ داتا صاحب نے ایک عام دنیا دار سے مرجع خلائق صوفی بننے تک کے مراحل یک بیک طے نہیں کر لئے تھے، بلکہ جملہ دنیاوی تجربات سے گزرنے کے بعد ہی دنیا داری سے توبہ کر کے تصوف کی طرف مائل ہوئے ہوئے تھے۔ دنیا داری کو ترک کر کے توبہ کرنے کا ذکر "کشف المحجوب" کے چودھویں باب میں آیا ہے جہاں آپ نے کرامت کے موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنا ایک ذاتی واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ آپ اوزکند سے فرغانہ کے گاؤں شلاتک میں ایک بزرگ باب عمر کی زیارت کو گئے جو اوتاد کے مرتبہ پر فائز تھے۔ اس علاقہ میں بزرگ درویشوں اور مشائخ کو باب کہتے تھے۔ وہاں پہنچے تو باب عمر نے پوچھا:

"اے بچے! کس لئے آئے ہو؟"

داتا صاحب نے جواب دیا: "حضور کو بچشم خود دیکھنے اور نظرِ کرم کی امید لیکر آیا ہوں"۔

باب عمر نے کہا: "میں تو تمہیں فلاں دن سے خود دیکھ رہا ہوں اور جب تک کوئی تجھے مجھ سے غائب نہ کر دے تب تک تجھے دیکھتا ہی رہوں گا"۔

داتا صاحب لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے روز و سال کا حساب لگایا تو یہ انکشاف ہوا کہ باب عمر نے جس دن سے انہیں دیکھنے کا بتایا تھا وہ دن ان کی توبہ کا روزِ اول تھا۔[۴۴] اس بات کا پتہ چلانا مشکل ہے کہ داتا صاحب کی زندگی کا یہ مبارک دور کب شروع ہوا تھا

تاہم باب عمر کیطرف سے داتا صاحب کو بچہ کہہ کر مخاطب کرنے سے خیال گزرتا ہے کہ انھوں نے نوجوانی میں ہی یہ راہ اختیار کر لی تھی۔

جمع اموال

"کشف المحجوب" کی ایک عبارت سے اشارہ ملتا ہے کہ طریق تصوّف اختیار کرنے سے پہلے یا فوراً بعد داتا صاحب پر ایک ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جس میں آپ عراق کے کسی شہر میں مقیم تھے اور دولت جمع کرنے اور اسے بے دریغ خرچ کرنے میں مصروف تھے یہاں تک کہ کافی زیر بار بھی ہو گئے۔ ہر حاجت مند انہی کے در پر پہنچتا اور انہیں ہر کسی کی بے ہودہ فرمائش پوری کرنے کے لئے تکلیف اٹھانا پڑتی۔

"سادات وقت میں سے ایک سید نے مجھے خط لکھا: اے بیٹے! جو دل ہوا و ہوس میں مشغول ہے اس کی خاطر تم اپنے دل کو خدائے عز و جل سے نہ ہٹاؤ۔ ہاں اگر تم کسی ایسے دل کو دیکھو جو تمہارے دل سے گرامی تر ہو تو اس کو راحت دینے کے لئے بلشک اپنے دل کو مشغول کرو۔ ورنہ رک جاؤ کیونکہ بندوں کے لئے خدا کافی ہے۔ چنانچہ مجھے فوراً اس کام سے فراغت ہو گئی۔"[۲۵]

شادی

حضرت داتا صاحبؒ نے شادی کی تھی؟ اس کے بارے میں کوئی واضح شہادت دستیاب نہیں۔ تاہم آپ نے "کشف المحجوب" میں اپنی محبت کا ایک قصہ لکھا ہے جس سے یہ خیال قائم کرنے میں مدد ملتی ہے کہ آپ ساری عمر مجرد نہیں رہے۔ "تزویج و تجرید" کے باب میں لکھتے ہیں:

"حق تعالیٰ نے مجھے گیارہ سال تک شادی کی آفت سے محفوظ رکھا لیکن اس فتنے میں مبتلا ہونا مقدر میں لکھا تھا۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہ تھا مگر اس کی جو صفات مجھ سے بیان کی گئیں انہیں سنکر میرا ظاہر اور باطن اسکا اسیر ہو گیا اور میں ایک سال تک اس کے خیال میں مستغرق رہا۔ نزدیک تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے کہ حق تعالیٰ نے کمال لطف اور تمام فضل سے میرے دل بیچارہ پر رحمت کی اور اس سے خلاصی عطا فرمائی[۲۶]۔"

اس بیان کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ داتا صاحب نے شادی کی تھی۔ مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر متاہلی زندگی سے آزاد ہو گئے۔ مذکورہ واقعہ اس رہائی کے گیارہ سال بعد پیش آیا۔ چونکہ آپ اس وقت صوفیانہ زندگی اختیار کر چکے تھے لہذا اس نادیدہ محبوب سے اپنے دین کی تباہی کا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ یہاں دین طریقت کے معنوں میں آیا ہے۔

اولاد

داتا صاحب نے خود یا ان کے کسی تذکرہ نویس نے اولاد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ آپ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ آپ کی کنیت ابوالحسن تھی۔ کشف المحجوب ص ۱۷۷ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت خواجہ مظفر نے داتا صاحب کو ابوالحسن کی کنیت سے یاد کیا ہے۔ یہ کنیت آپ کے شادی شدہ اور صاحب اولاد ہونے کیطرف اشارہ کرتی ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں — کہ بعض بزرگوں نے فرضی کنیت بھی اختیار کی ہے لیکن مندرجہ بالا واقعہ میں پہلی شادی کیطرف اشارہ موجود ہونے کے باعث اس کنیت کو فرضی نہیں سمجھنا چاہیئے۔

لباس

حضرت داتا صاحب ایک کامل صوفی ہونے کے باوجود لباس کے معاملہ میں آزاد تھے۔ صوفیوں کی تقلید میں لازماً صوف یا گدڑی نہیں پہنتے تھے، بلکہ جو کچھ میسّر آتا پہن لیتے تھے۔ کشف المحجوب کے چوتھے باب میں مرقع (گدڑی) کو صوفیاء کا شعار اور سنت نبوی قرار دیا ہے[۲۷] اور پھر صوفیا کے لئے گدڑی کی ضرورت پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ کے لوگوں کو جب حصولِ جاہ کا اور کوئی ذریعہ نہیں ملتا گدڑی پہن لیتے ہیں اور فقیرانہ گدڑی کے ذریعے سرداری اور عزت و توقیر طلب کرتے ہیں۔"[۲۸] اسی باب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "صوفیہ کے ایک گروہ نے لباس کے بارے میں تکلّف روا نہیں رکھا۔ اگر خدا تعالیٰ نے انہیں عبا دی تو پہن لی، اگر قبا دی تو پہن لی اور اگر برہنہ رکھا تو اسے قبول کیا میں کہ علی بن عثمان الجلابی ہوں ــ یہی طریقہ پسند کرتا ہوں اور اسی کو اپنا شعار بنایا ہے۔"[۲۹]

علمی تحقیق

داتا صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزرا۔ اس کے باوجود سفر و حضر میں تحقیق و تصنیف اور درس و تدریس کے مشاغل جاری رکھے۔ آپ نے علمی تحقیق کے لئے جو مصیبتیں اٹھائی ہیں، ان کا ذکر کشف المحجوب میں کئی جگہ ملتا ہے اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ کا ہر سفر حصولِ علم یا کسی علمی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ مثلاً "اقامت میں صحبت کے آداب" کے باب میں لکھتے ہیں کہ:

> ایک دفعہ میں نے دو درویشوں کے ساتھ ابن المعلا کی

زیارت کے لئے دمشق سے رملہ کا قصد کیا۔ راستے میں ہم نے طے کیا کہ ہر شخص دل میں کوئی ایسی بات سوچ لے جس کا حل درکار ہو تاکہ وہ پیر ہمارے باطن سے مطلع ہو کر وہ عقدہ حل کر دیں۔ میں نے کہا کہ ان سے حسین (بن منصور الحلاج) کے اشعار و مناجات کی درخواست کروں گا — دوسرے نے کہا کہ میں دعا کراؤں گا کہ میرا مرض طحال جاتا رہے — تیسرے نے کہا کہ میں حلوائے صابونی کھانا چاہوں گا جب ہم وہاں پہنچے تو انھوں نے حکم دیا کہ وہ جزو میرے سامنے رکھ دیا جائے جس میں حسین کے اشعار و مناجات لکھے تھے دوسرے درویش کے پیٹ پر ہاتھ پھیر دیا جس سے اس کی تلی کم ہو گئی اور تیسرے سے فرمایا کہ صابونی حلوہ تو سپاہیوں (جوانوں) کی غذا ہے تو نے اولیاء کا لباس پہن رکھا ہے اولیاء کے لباس میں سپاہیوں کی طلب درست نہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر لو"[۳۰]

اسی طرح حسین بن منصور الحلاج کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ: ———

"میں نے ان کی پچاس تصانیف بغداد اور اس کے نواح میں دیکھی ہیں اور بعض نسخے خوزستان اور فارس، اور خراسان میں"[۳۱]

اسی طرح فرقہ سیاریہ کے بیان میں اپنے تحقیقی ذوق کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے ابوالعباس سیاری کے مذہب کے سوا کوئی مذہب تصوف میں اپنے حال پر قائم نہیں رہا۔ نسا میں رہنے والے سیاریوں نے مرو کے سیاریوں

کو کچھ عمدہ رسائل اور خطوط لکھے :

" میں نے ان خطوط میں سے بعض کو مرو میں خود دیکھا ہے جو بہت خوب ہیں اور ان کا موضوع جمع و تفرقہ ہے "[۳۲]

اسی طرح ابویزید سے ایک سوال کے بارے میں لکھا ہے کہ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے ؟ تو آپ نے فرمایا "چار سال" داتا صاحب اپنی تحقیق بتاتے ہیں کہ ایک نسخہ میں ہے کہ "چالیس سال"[۳۳]

ذاتی ذخیرۂ کتب

داتا صاحب نے اس تحقیقی ذوق کے باعث کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ ان میں آپ کی ذاتی کتابیں بھی ہیں اور دوسروں کی لکھی ہوئی بھی۔ داتا صاحب نے کشف المحجوب میں مختلف مقامات پر اپنی نو تصنیفات کا حوالہ دیا ہے۔ ان میں دو کتابیں ایسی ہیں جنھیں کسی ادبی چور نے اپنے نام کر لیا تھا۔ ان پر تفصیلی بحث، داتا صاحب کی تصنیفات کے باب میں کی جائے گی۔ یہاں صرف داتا صاحب کے ذاتی ذخیرہ کتب کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ "کشف المحجوب" میں داتا صاحب نے دوسرے مصنفوں کی کم و بیش بیس کتابوں کے حوالے پیش کئے ہیں[۳۴]۔ کشف المحجوب میں سلیم الراعی کے تذکرہ میں داتا صاحب نے بصد حسرت لکھا ہے کہ :

" اس وقت اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں کیونکہ میری کتابیں غزنین حرسہا اللہ میں رہ گئی ہیں "[۳۵]

اسے ہماری بدقسمتی کہیے کہ زمانے کے الٹ پھیر نے اس ذخیرے کو اس طرح منتشر کیا ہے کہ آج ہمیں داتا صاحب کی تصنیفات میں سے "کشف المحجوب" کے سوا کچھ دستیاب نہیں۔

دعوت و ارشاد

داتا صاحب عبادات، تحقیق اور تصنیف و تالیف کے اشغال کے ساتھ مسندِ ارشاد بھی آراستہ کرتے تھے اور علمی مسائل پر بحث و مناظرے کیلئے بھی وقت نکال لیا کرتے تھے۔ مبتدیوں کو تعلیم دینے کا ایک اشارہ زکوٰۃ کے باب میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"اس زمانہ کی خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ نیکی اور فقر کے مدعی اپنی جہالت سے علم کو ترک کر دیتے ہیں ایک دفعہ میں مبتدی صوفیوں کی ایک جماعت کو صدقہ کے مسائل سکھا رہا تھا کہ ایک جاہل آ گیا، اس وقت اونٹ کے دو۔ تین اور چار سالہ بچے کی زکوٰۃ زیر بحث تھی۔ وہ جاہل ان باتوں سے اکتا کر کہنے لگا کہ میرے پاس تو کوئی اونٹ نہیں کہ یہ علم مجھے درکار ہو۔ میں نے کہا اے شخص اگر کسی کے پاس مال نہ ہو اور مال کی ضرورت بھی نہ ہو تب بھی علم کی فرضیت اس سے ساقط نہیں ہوتی۔"

مناظرے

"کشف المحجوب" میں کئی جگہ علمی مسائل پر مناظرہ کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً پہلے باب میں مذہب سوفسطائیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ایک دفعہ میرا اہل علم میں سے ایک شخص سے مناظرہ ہوا جس نے کلاہ غرور کا نام عزت اور خواہش

نفس کی متابعت کا نام سنتِ رسولؐ اور شیطان
کی موافقت کا نام ائمہ دین کی سیرت رکھا ہؤا
تھا - اثنائے مناظرہ میں اس نے کہا کہ ملحدین کے
بارہ گروہ ہیں - ان میں سے ایک گروہ اہلِ تصوّف
کا ہے - مَیں نے کہا کہ اگر ایک گروہ اہلِ تصوّف
ہیں تو گیارہ گروہ تم لوگوں کے ہیں ، اہلِ تصوّف
ایک گروہ ہو کر بھی جس طرح اپنی حفاظت کر سکتے
ہیں تم گیارہ ہو کر بھی اس طرح اپنی حفاظت نہیں
کر سکتے"[۳۷]

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے سوانح حیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ایک دفعہ غزنین حرسہا اللہ میں ایک شخص نے
جو امامت اور علم کا مدعی تھا کہا کہ گدڑی پہننا
بدعت ہے - مَیں نے کہا کہ حشیشی اور دبیقی جو
ریشمی کپڑے ہیں اور جن کا پہننا مردوں پر حرام
ہے اور ظالموں کے مال سے جو حرام مطلق ہے ،
آہ و زاری کر کے حاصل کرنا تو اور بھی حرام ہے -
تم اسے تو بے تکلف لے لیتے اور پہن لیتے ہو ،
اور مجبول کر بھی نہیں کہتے کہ یہ بدعت ہے لیکن
ایک حلال کپڑا جو حلال کمائی سے خریدا گیا ہے تم
اسے بدعت کہتے ہو"[۳۸]

اسی طرح ہندوستان میں ایک مناظرہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :-

"تفسیر و تذکیر اور علم کے ایک مدعی نے فنا و بقا کے مسئلہ پر مجھ سے مناظرہ کیا۔ جب میں نے خوب غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ شخص نہ تو فنا کو پہچانتا ہے اور نہ ہی بقا کو جانتا ہے اور نہ قدیم و حادث میں فرق کر سکتا ہے۔ جاہلوں میں اِس قسم کے لوگ بہت ہیں[۳۹]"

امامت و خطابت

"کشف المحجوب" کی بعض عبارتوں سے داتا صاحب کے امامت و خطابت فرمانے کے اشارے بھی ملتے ہیں۔ داراشکوہ نے بتایا ہے کہ داتا صاحب نے ایک مسجد خود تعمیر کی تھی جسکا محراب دوسری مساجد کی بہ نسبت قدرے جنوب کیطرف مائل تھا۔ علمائے وقت نے اس پر اعتراض کیا تو ایک دن داتا صاحب نے سب معترضین کو جمع کر کے امامت فرمائی اور بعد نماز پوچھا کہ اب دیکھو کعبہ کس طرف ہے؟ تمام حجابات درمیان میں سے اُٹھ گئے تھے اور کعبہ سامنے نظر آ رہا تھا[۴۰]۔ کشف المحجوب میں نماز کے باب میں اسی ضمن میں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ: "قبلۂ ظاہر کعبہ ہے اور قبلۂ باطن عرشِ معلّے[۴۱]"

وفات

حضرت داتا صاحب کی تاریخ ولادت کی طرح تاریخ وفات بھی ٹھیک سے معلوم نہیں ہے۔ اس ضمن میں تذکرہ نویسوں کے بیانات اسقدر مختلف اور متضاد ہیں کہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا محال ہے۔ معروف و مقبول قول کے مطابق داتا صاحب

کی تاریخ وفات ۲۰ صفر ۴۶۵ھ بمطابق ۵ نومبر ۱۰۷۲ء ہے۔ آپ کا عرس بھی ہر سال ۲۰ صفر کو منایا جاتا ہے اور مزار کے موجودہ کتبہ پر بھی یہی تاریخ لکھی ہے، یہ تاریخ کیسے متعین ہوئی ؟

اِس سوال کا جواب معلوم کرنا محال ہے ۔۔۔ داتا صاحب کا سب سے قدیم تذکرہ " نفحات الانس " مرتبہ نورالدین جامی ہے جو ۸۸۳ ھ / ۱۴۷۸ء میں مکمل ہوا۔ اس میں داتا صاحب کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کے ضمن میں مکمل سکوت اختیار کیا گیا ہے[۴۲]۔ آئینِ اکبری میں بھی وفات کے سال کی صراحت نہیں کی گئی[۴۳] ۔۔۔ البتہ "ثمرات القدس" مؤلفہ لعل بیگ بخشی میں پہلی مرتبہ سالِ وفات کی صراحت ملتی ہے۔ اس نے ایک عجیب و ناقابلِ فہم کہانی سنائی ہے کہ داتا صاحب چالیس بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن بچوں کی شوخی بہت ناگوار گزری اور منع کرنے پر بھی وہ شرارت سے باز نہ آئے تو داتا صاحب نے بد دعا دی۔ جس سے وہ سب مر گئے۔ پھر افسوس ہوا تو اپنے وصال کی بھی دعا کی، جو مقبول ہوئی اور یہ واقعہ سن چار سو چھپن میں پیش آیا[۴۴]۔

داتا صاحب کے تذکرہ کے سب سے مقبول ماخذ " سفینۃ الاولیاء " مؤلفہ شہزادہ دارا شکوہ میں وفات کے بارے میں دو مختلف اقوال رقم کیے گئے ہیں ایک قول کے مطابق وفات چار سو چھپن میں ہوئی۔ یہ تاریخ " ثمرات القدس " سے مطابقت رکھتی ہے ۔۔۔ دوسرے قول کے مطابق داتا صاحب کا سنِ وفات ۴۶۴ھ لکھا ہے لیکن پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دارا شکوہ کے قلم سے لکھے ہوئے جس نسخے کا عکس موجود ہے اس میں سن چار سو لکھ کر آگے جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے[۴۵] ۔۔۔

" کشف الظنون " میں حاجی خلیفہ نے اور " قاموس الاعلام " میں سامی بیگ نے سن وفات ۴۵۶ھ ہی لکھا ہے[۴۶]۔

" خزینۃ الاصفیا " میں مفتی غلام سرور نے سفینۃ الاولیاء سے وفات کی جو

تاریخیں نقل کی ہیں وہ سفینۃ الاولیاء کے مطبوعہ نسخہ (نولکشور) سے مختلف ہیں۔ تاہم انہوں نے اپنی رائے یہ بتائی ہے کہ داتا صاحبؒ نے ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔ مفتی صاحب نے اپنے اس فیصلہ کو "نفحات الانس" پر مبنی قرار دیا ہے ـــ حالانکہ "نفحات الانس" کا غالباً سب سے قدیم نسخہ مولوی محمد شفیع مرحوم کے پاس تھا، لیکن اس میں اور مطبوعہ نسخوں میں ولادت اور وفات کے سنوں کی کوئی صراحت نہیں ملتی۔[48]

"تحقیقات چشتی" میں مولوی نور احمد چشتی نے داتا صاحب کے سالِ وفات کے ضمن میں جامی، داراشکوہ اور مفتی غلام سرور کی بیان کردہ تاریخیں نقل کر دی ہیں اور ان میں مفتی غلام سرور صاحبؒ کے ایک خط کے مطابق سن ۴۶۵ھ کا اضافہ کیا ہے۔[49]

"ماثر الکرام" مولفہ آزاد بلگرامی اور "حدائق الحنفیہ" میں بھی سال وفات ۴۶۵ھ ہی دیا ہے۔[50] "نزہت الخواطر" مؤلفہ عبدالحی میں بھی ۴۶۵ھ دیا گیا ہے لیکن نہ جانے کس سند کی بنا پر ماہ وفات صفر کے بجائے ربیع الاول قرار دیا ہے۔[51] ہمارے زمانہ کے ممتاز تذکرہ نویسوں میں سے ہدایت حسین نے دائرۃ المعارف اسلامی میں،[52] مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے "تصوّفِ اسلام"[53] میں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے "بزم صوفیہ"[54] میں اور شیخ محمد اکرام نے "آب کوثر"[55] میں داتا صاحب کا سالِ وفات ۴۶۵ھ قرار دیا ہے۔

(م) سالِ وفات کی تحقیق

مذکورہ علماء کے برعکس عہدِ حاضر کے بعض علماء نے ۴۶۵ھ کو سالِ وفات ماننے سے انکار کیا ہے اور اس کی بنیاد "کشف المحجوب" کی داخلی شہادتوں پر رکھی ہے۔ پروفیسر نکلسن نے کشف المحجوب کے انگریزی ترجمہ (۱۹۱۱ء) کے دیباچہ میں لکھا کہ:

"داتا صاحب نے "کشف المحجوب" میں صوفیائے متاخرین کے اماموں کے ضمن میں بتایا ہے کہ — "اس باب میں جن صوفیا کا حال رقم کر رہا ہوں ان میں سے بعض تو وفات پا چکے ہیں اور بعض ابھی تک زندہ ہیں" — لیکن جن دس صوفیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے صرف ایک یعنی ابو القاسم گرگانی کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے کتاب کے زمانۂ تالیف میں ان کے بقیدِ حیات ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ سفینۃ الاولیاء میں گرگانی کی وفات ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء بتائی گئی ہے اگر یہ تاریخ درست ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ کشف المحجوب قشیری کی رحلت سے کم از کم پندرہ سال پہلے لکھی گئی ہوگی۔ دوسری طرف "شذرات الذہب" کے قلمی نسخہ میں جو میرے پاس ہے ابو القاسم گرگانی کی رحلت ۴۶۹ھ / ۱۰۷۶ء کے سال میں مندرج ہے اور مجھے یہ تاریخ زیادہ قرینِ قیاس لگتی ہے اور اس طرح یہ بیان بھی قابلِ قبول ہو جائے گا کہ مصنف (داتا صاحب) قشیری کے بعد بھی زندہ رہے۔ قشیری کے بعد تک زندہ رہنے کا بیان منفی شہادت پر مبنی ہے کیونکہ ہم اس امر پر زیادہ زور نہیں دے سکتے کہ کشف المحجوب میں بعض جگہوں پر قشیری کے نام کے آگے "رحمۃ اللہ علیہ" لکھا ملتا ہے (لہذا وہ لازماً زمانۂ تالیفِ کشف میں انتقال کر چکے

تھے، میرا خیال ہے کہ مصنّف کی رحلت ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء
اور ۴۶۹ھ/۱۰۷۶ء کے درمیان ہوئی ہوگی۔"[59]

اس کے بعد مولوی محمد شفیع مرحوم نے اس آخری تاریخ میں مزید دس سالوں کا اضافہ کر دیا۔ لکھتے ہیں:

"بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ (علی الہجویریؒ)
اس (۴۶۵ھ) سے کئی سال بعد تک زندہ رہے۔"

پھر دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مفصّل بحث کا یہ مقام نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہے، کہ
حضرت داتا صاحب نے کشف المحجوب میں متعدد شیوخ کا
ذکر بصیغہ ماضی کیا ہے مثلاً کہا ہے کہ فلاں بزرگ زہد و تقویٰ
اور صلاحیت میں ایسے ایسے تھے۔ اب ان بزرگوں کی
وفات کی تاریخیں دیکھیں تو وہ ۴۶۰ھ/۱۰۶۷ء سے ——
۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء تک پہنچتی ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ حضرت
شیخ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا
ہے کہ جناب ہجویری کی وفات ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء یا اس
کے بعد ہوئی ہوگی۔"[60]

مولانا علم الدین سالک مرحوم نے مولوی محمد شفیع کے بیان میں یہ اضافہ کیا ہے کہ:

"کشف المحجوب" میں بعض بزرگوں کے لئے ماضی بعید کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب مذکورہ کی تصنیف کے وقت یہ بزرگ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان میں امام ابوالقاسم قشیری (المتوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) —— ابوالحسن سالبہ (المتوفی ۴۷۳ھ/۱۰۸۰ء) —— ابوعلی فارمدی (المتوفی ۴۷۷ھ/۱۰۸۴ء)

شیخ عبداللہ انصاری ہروی (المتوفی ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء) خاص طور پر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان کے حالات اور سنین پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں، کہ کشف المحجوب ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء کے بعد مکمل ہوئی اور آپ اس کے بعد بھی زندہ رہے اس لئے آپ کی وفات کا زمانہ : ۴۸۵ھ ۱۰۹۲ء اور ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶ء کے درمیان تعین کیا جا سکتا ہے اور زیادہ اغلب یہی ہے کہ آپ ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۶ء کے آغاز میں فوت ہوئے ہوں[۵۸]۔"

آقائے عبدالحی حبیبی نے خاص تاریخ وفات کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے[۵۹]، انہوں نے بھی 'کشف المحجوب' میں بعض بزرگوں کا ذکر صیغہ حال و ماضی بعید میں آنے پر اپنے استدلال کی عمارت تعمیر کی ہے مثلاً : "استاد ابوالقاسم قشیریؒ اندر زمانہ خود بدیع بود[۶۰]"۔ "شیخ الشیوخ ابوالفتح سالبہ افصح اللسان بود[۶۱]"۔ "ابو علی فضل بن محمد فارمدی کا ذکر "ابقاہ اللہ" کے دعائیہ جملہ کے ساتھ فرماتے ہیں[۶۲]"۔ شیخ سہلکی کا ذکر یوں کیا ہے : "امام آں دیار بود و وی را خلقے نیک بود[۶۳]"۔ الشنقانی کی بابت ان کے الفاظ یہ ہیں : "مرا با وی انسی عظیم بود ..... اندر بعض علوم استاد من بود۔" الاشنقانی نے سن ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں وفات پائی اور صیغہ بود سے ظاہر ہے کہ حضرت ہجویری ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء کے بعد بھی بقید حیات تھے[۶۴]۔"

اس کے بعد حبیبی نے داتا صاحب کی عمر کو ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء سے آگے لے جانے کے لئے خواجہ عبداللہ انصاریؒ کے نام پر رحمۃ اللہ لکھے ہونے پر انحصار کیا ہے اور پھر ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء سے پہلے کشف المحجوب کے مکمل ہو چکنے کے حق میں شیخ قسورۃ گردیزی کا ذکر بصیغہ حال .... "بر یک را بنزدیک وی حرمتی ہست و مشائخ را دیدہ است" کو دلیل بنایا ہے[۶۵]۔ حبیبی کے دلائل میں صرف یہی کمزور کڑی ہے کہ انھوں نے خواجہ عبداللہ انصاری کے نام پر 'رحمۃ اللہ علیہ' لکھے ہونے پر انحصار کیا ہے۔

یہ طرزِ استدلال سب سے پہلے ریو نے "برٹش میوزیم میں فارسی مخطوطات کی فہرست" جلد اول صفحہ ۳۴۳ پر اختیار کیا تھا لیکن نکلسن نے ۱۹۱۱ء میں ہی اسے ناقابلِ اعتنا قرار دے دیا تھا[۶۶]۔ مجید یزدانی نے بھی اس طرزِ استدلال کے ضعف پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کسی بزرگ کے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ کی موجودگی ان کی رحلت کا ثبوت ہو سکتی ہے تو پھر اس کی کیا توجیہہ کی جائے گی کہ کشف المحجوب کے آغاز میں اپنے نام کے آگے بھی رضی اللہ عنہ اور دوسری جگہوں پر رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے لہٰذا کسی نام کے آگے رض یا رح لکھے ہونے سے اس کا فوت ہو چکا ہونا ثابت نہیں ہوتا[۶۷]" آقائے حبیبی اور محترم یزدانی نے اس نکتے کو ملحوظ نہیں رکھا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ "کشف المحجوب" میں اپنے یا بزرگوں کے ناموں پر رح اور رض ضرور داتا صاحب نے لکھے ہوں گے۔ ابھی تک داتا صاحب کے قلم کا یا ان کی حیات کے زمانے کا لکھا ہوا کوئی بھی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ فی الوقت "کشف المحجوب" کا سب سے پرانا مخطوطہ وہ ہے جو مولوی محمد شفیع مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں ہے[۶۸]۔ ماسکو ایڈیشن کے مدوّن کو اس کی موجودگی کا علم تھا لیکن اسے یا نکلسن کو اس سے استفادہ کا موقع نہیں ملا۔ یہ نسخہ ۶۶۴ھ/۱۲۵۶ء میں لکھا گیا تھا اور اس کی صحت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) جیسے ولی کامل کا نقل کردہ ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رح یا ان سے کہیں کمتر درجے کا کوئی شخص دو ڈھائی سو سال بعد "کشف المحجوب" کی نقل تیار کرے تو جن بزرگوں کا نام آئے ان پر رضی اللہ عنہ یا رحمۃ اللہ علیہ کا اضافہ نہ کر دے۔ لہٰذا ان کلمات کی موجودگی سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کشف المحجوب کے اصل نسخہ میں یہ کلمات موجود تھے انہیں نقل نویس کی ارادت کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر داتا صاحب کا سال وفات معلوم کرنے کیلئے کشف المحجوب کی داخلی شہادتوں پر انحصار کرنا ہو تو پھر صیغہ حال و ماضی بعید ہی کو قابل قبول مانا جا سکتا ہے اور یوں داتا صاحب کا سال وصال ۴۸۱ھ سے آگے لیجایا نہیں جا سکتا

باب ۲

مزار ⑦

****

داتا صاحب کا مزار صدیوں سے مرجع خلائق ہے۔ ہر زمانے میں اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ اب محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام مزار کی توسیع اور آرائش کا سلسلہ شروع ہے مزار کا دروازہ لاکھوں روپے کے خرچ سے ایران سے بن کر آیا ہے ان تعمیرات کے بعد داتا صاحب کا مزار بالکل مختلف دکھائی دے گا۔

روایات کے مطابق داتا صاحب کا مزار سب سے پہلے سلطان ابراہیم نے تعمیر کرایا تھا۔"تحقیقات چشتی" کے مطابق آج سے ایک صدی پہلے مزار کا نقشہ یوں تھا:

"مزار سنگ مرمر کے چبوترہ پر ہے۔ سنگ مرمر پر سنگین گلکاری کی گئی ہے۔ مزار کے دو درجے ہیں۔ پہلا درجہ دو فٹ اونچا ہے اور دوسرا اس سے ایک فٹ بلند ہے اور اس پر تعویذ مزار ہے۔ لطف یہ کہ مزار ڈھائی گز طویل اور سات گز عریض ہے ایک ہی پتھر کا بنا ہوا ہے۔ خدا جانے سنگ مرمر کا وہ تختہ کتنا بڑا ہوگا جس سے یہ تعویذ نکالا گیا ہے۔ چبوترے پر لکڑی کا ایک ہشت پہلو پنجرہ ہے جو ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فیل بان میاں عیوض خاں نے بنوایا تھا۔ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں نور محمد سادھو نے لکڑی کے

پنجرہ کے اوپر ایک گنبد تعمیر کرایا ہے۔ میڈیکل کالج (لاہور) کے ڈاکٹر محمد حسین نے چاروں طرف آئینے لگوائے ہیں۔"

"تحقیقاتِ چشتی" کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۱ء سے پہلے مزار پر گنبد نہیں تھا۔ بعد ازاں مولوی فیروز الدین مرحوم نے ۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء میں عیوض خاں کے چوبی پنجرہ کی جگہ سنگِ مرمر کے ستون اور جالیاں لگوائیں — اور نور محمد سادھو کے گنبد کی جگہ سبز روغنی ٹائلوں سے نیا گنبد بنوایا۔

داتا صاحبؒ نے اپنے زمانہ میں جو مسجد بنوائی تھی اور جس کے رُخ قبلہ کے ٹیڑھے پن پر علمائے لاہور نے اعتراض کیا تھا، اب باقی نہیں۔ البتہ جہاں داتا صاحب کی مسجد کا محراب تھا۔ وہاں سنگِ سیاہ سے نشان لگا دیا ہے جو جدید مسجد کے صحن میں مزار کے قریب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسجد زیادہ بڑی نہ تھی۔ تحقیقاتِ چشتی کی روایت ہے کہ داتا صاحب نے جو مسجد بنوائی تھی اس پر گنبد نہ تھے، صرف لکڑی کی چھت تھی۔ اس کتاب کی تالیف کے زمانہ ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء میں گلزار شاہ سادھو نے سابقہ بنیادوں پر نئی مسجد تعمیر کرائی اور اس پر گنبد بھی بنوائے۔ ہمارے قریبی زمانہ میں لکڑی کے ایک ٹھیکیدار نے زرِ کثیر صرف کر کے پرانی مسجد کی جگہ نئی مسجد تعمیر کرائی۔ اس مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں علامہ اقبال مرحوم نے جو قطعہ لکھا تھا اس کا مرمریں کتبہ مسجد کی مشرقی دیوار میں نصب تھا۔ محکمہ اوقاف نے مزار کی توسیع کے لئے یہ دیوار گرا دی ہے۔ نہ جانے علامہ اقبال کے یادگار تاریخی کتبے کا کیا بنا ہے!

داتا صاحبؒ کے مزار کے اردگرد دالان تھے جو مختلف اوقات میں مختلف اصحاب نے تعمیر کرائے۔ چشتی کے بقول نواب خان خاناں نے سنگِ سیاہ کا ایک سہ درہ دالان بنوایا تھا جو کتاب کی تالیف سے ایک صدی پہلے یعنی ۱۷۶۸ء کے

نواح میں ایک زلزلہ کے باعث منہدم ہو گیا تھا۔ اسے رنجیت سنگھ کے مختار ٹکسال محمد خاں نے پختہ اینٹوں سے دوبارہ تعمیر کرایا۔ چشتی نے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے بنوائے ہوئے دالان، نشست گاہ اور چار دیواری کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کی مرمت راجہ رنجیت سنگھ نے کرائی تھی[۲]۔

خواجہ اجمیر کا حجرۂ اعتکاف

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح نے داتا صاحب رح کے مزار پر جس جگہ چلہ کشی کی تھی وہاں اکبر نے ایک کمرہ بنوا دیا۔ چشتی کے زمانہ میں اس کمرے کے اوپر گنبد تھا، اور اندر جانے کے لئے لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا[۵]۔

قرآن حکیم کے نادر نسخے

مزار داتا گنج بخش رح کی ایک خاص چیز قرآن مجید کے وہ نسخے تھے جو مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے پیش کئے تھے۔ مؤلف تحقیقات چشتی نے شمالی دالان کے متعلق بتایا ہے کہ اسے بھائی میرا صاحب کنور نول سنگھ نے بنوایا تھا۔ مگر رانی چند کور نے اور زمین شامل کر کے دالان کو کشادہ کرایا اور اوپر چھت ڈلوائی۔ اس دالان میں ... قرآن شریف رکھے رہتے کہ عقیدت مند ان کی تلاوت کریں۔ چار قرآن شریف ایسے ہیں جن کے ہر پارہ کی جلد علیحدہ ہے۔ ان میں سے ایک موراں، داشتہ رنجیت سنگھ نے ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں پیش کیا تھا۔ ایک نادر نسخہ وہ تھا جسے نظام حیدرآباد دکن مومن الملک علاء الدولہ جعفر خاں نصیر بہادر ناصر جنگ نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر ۱۱۳۷ھ / ۲۵-۱۷۲۴ء میں پیش کیا تھا، اور اس کی تلاوت کے لئے اپنے خرچ پر ایک قاری بھی مقرر کیا تھا۔ بڑی بڑی رحلوں پر سات قرآن شریف ایسے رکھے ہیں جو بہت بڑے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا طول ایک گز اور عرض دس گرہ ہے۔

چار نسخے ان سے چھوٹے ہیں مگر وہ بھی دس گرہ طول کے ہیں۔
ایک قرآن بہت پرانا ہے جو بہاری خط میں مشک کے ساتھ لکھا گیا ہے۔
اسی طرح خط ثلث میں لکھا ہوا ایک نہایت پرانا نسخہ موجود ہے۔ ایک خط ملتانی میں
لکھا گیا ہے اور نواب ملتان کا ھدیہ ہے"۔ افسوس کہ یہ بیش بہا تاریخی ذخیرہ، بعض
نااہل سرکاری ملازموں کی نالائقی سے ضائع ہو چکا ہے۔ جب محکمہ اوقاف نے داتا
صاحبؒ کے مزار کو اپنی تحویل میں لیا تو کسی نالائق افسر نے یہ سارے قلمی نسخے بوریوں میں
باندھ کر راوی میں بہا دینے کے لئے بھیج دیئے۔ تاہم بعض اجزاء دریا برد ہونے سے
بچ گئے اور نوادر کے شیدائی فقیر سید مغیث الدین مرحوم کے ہاتھ لگ گئے، اور
یوں محفوظ ہو گئے۔ مرحوم نے اس تاریخی خزانے کے اتلاف کی کہانی بچشم نم سنائی اور بچے
ہوئے اجزا دکھائے جن میں سے ایک تو یقیناً اکبری دور کی خطاطی کا نمونہ ہے۔ اگر یہ
خزانہ نالائق اہلکاروں کے ہاتھ نہ لگتا تو آج دارالقرآن میں سجا ہوتا، نیز اسے دنیا میں فرد
بنا دیتا۔

متولّی

روایت ہے کہ داتا صاحبؒ کے ہاتھ پر پنجاب کے حاکم رلٹے راجو نے اسلام قبول
کیا۔ داتا صاحبؒ نے اس کا اسلامی نام نہ جانے کیا رکھا مگر وہ شیخ ہندی کے نام سے مشہور
ہوا۔ مزار کی خدمت اور مجاوری اسی کے خاندان سے مخصوص چلی آتی ہے۔
شیخ ہندی کی بارہ پشتوں تک ایک ہی فرزند ہوتا رہا، تا آنکہ اکبر کے عہد میں شیخ
لطف اللہ کے ہاں ایک سے زیادہ فرزند ہوئے اور یہ روایت ٹوٹ گئی۔ مزار کی آمدنی
تمام مجاوروں میں برابر بٹ جاتی۔ جس دن کوئی بچہ پیدا ہوتا، اسکا حصہ جاری ہو جاتا ہے
اور جس دن کوئی فوت ہوتا ہے اسکا حصہ بند ہو جاتا ہے۔
۱۹۵۹ء میں محکمہ اوقاف نے مزار کو اپنی تحویل میں لیا تو مجاوروں کو مزار کی آمدنی

نظم ونسق اور رسومات کی ادائیگی سے محروم کر دیا۔ ۱۹۷۴ء میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا ہے کہ مزار کی آمدنی بے شک مجاوروں کو نہ دی جائے لیکن تمام رسومات مجاوروں کے ہاتھ سے ہی انجام پانی چاہئیں۔

محکمۂ اوقاف کے اعداد وشمار کے مطابق ۷۴-۱۹۷۳ء میں مزار سے ۳۸ لاکھ روپے کی آمدنی ہوئی۔ اس سالانہ آمدنی سے مزار کی توسیع کے اخراجات کے علاوہ ایک فری ہسپتال چلایا جاتا ہے۔ ایک دار المطالعہ قائم کیا گیا ہے اور مزار پر پیش کئے جانے والے کپڑوں اور زیورات سے یتیم بچیوں کو جہیز دیا جاتا ہے۔

باب ۳

ورودِ مسعود

****

یہ ہماری بدقسمتی نہیں تو کیا ہے کہ داتا صاحب کو اپنے یا فوراً بعد کے زمانہ میں کوئی تذکرہ نویس نہ ملا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی عقیدت مند اہلِ قلم نے داتا صاحب کے سوانحِ حیات قلمبند کئے ہوں اور وہ غزنوی عہد کی بہت سی تصنیفات کی طرح زمانے کے الٹ پھیر کی نذر ہو گئے ہوں۔ اس وجہ سے داتا صاحب کے سوانح نگاروں کو ہر مرحلہ پر ظن اور قیاس کا سہارا لینا پڑتا ہے اور یوں ہم کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔

لاہور میں ورُود

داتا صاحب کے لاہور میں ورود کا زمانہ متعین کرنے میں بھی مشکل درپیش ہے۔ "نفحات الانس" اور "سفینۃ الاولیاء" میں داتا صاحب کے لاہور تشریف لانے کی کوئی تاریخ نہیں بتائی گئی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد (۱۷ویں صدی عیسوی) کے ایک مؤرخ سبحان رائے بٹالوی نے اغلباً پہلی بار داتا صاحب کے ورود لاہور کا زمانہ ہمیں بتایا ہے۔ وہ صوبۂ دارالسلطنت لاہور کے ذیل میں لکھتا ہے:

"لاہور میں سرتاجِ اولیائے عظام حضرت میر علی ہجویری رح

کی خواب گاہ ہے جو ولی ہونے کے علاوہ علم و فضل
میں بھی کامل تھے ۔ وہ محمود غزنوی کے ہمراہ غزنی سے
لاہور آئے اور یہیں فوت ہوئے ۔ سلطان کا عقیدہ تھا
کہ لاہور کی فتح انہیں کی توجہ سے ہوئی[۲]"

ہم گذشتہ باب میں داتا صاحب کی ولادت کے زمانہ پر روشنی ڈال چکے ہیں جو چوتھی صدی کے آخری یا پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی ایام تھے ۔ مولوی محمد شفیع مرحوم نے لکھا ہے :

" یہ امر طے شدہ ہے کہ سلطان کے حملوں کا زمانہ ۳۹۲ھ/۲-۱۰۰۱ء
اور ۴۱۵ھ/۲۴-۱۰۲۴ء تک تھا ۔ اگر داتا صاحب ۴۱۵ھ/۱۰۲۴ء
میں بھی لاہور آئے ہوں تو ان کی عمر پندرہ بیس سال کے قریب
ہوگی جو ان کارناموں کے لئے موزوں عمر نہیں[۳] "

اسی طرح "رسالہ ابدالیہ" مؤلفہ یعقوب بن عثمان الغزنوی کی یہ روایت بھی درست نہیں لگتی کہ داتا صاحبؒ نے محمود غزنوی کے دربار میں ایک ہندو فلسفی سے مناظرہ کیا اور اپنی کرامات سے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا[۴] ۔ محمود غزنوی داتا صاحب کے لڑکپن یعنی ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء میں انتقال کر چکا تھا ۔

کشف المحجوب کا ایک نسخہ لاہور سے ۱۹۲۳ء میں مولانا احمد علی استاد اسلامیہ کالج و خطیب شاہی مسجد کی تصحیح کے بعد شائع ہوا تھا ۔ اس کے خاتمے پر کاتب صاحب نے داتا صاحب کے سوانح حیات کا اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"پہلے آپ نے خراسان وغیرہ کا سفر کیا ۔ پھر پیر کے حکم سے
ہندوستان آئے ۔ اس بارے میں دو روایتیں ہیں :
ایک تو یہ کہ سلطان مسعود بن محمود غازی کے ساتھ آئے

دوسری یہ کہ لاہور میں ورود سلطان مسعود کے آخری سال
۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء میں ہوا۔"

تعجب ہے کہ سید ہاشمی فرید آبادی مرحوم ایسے محقق نے کاتب صاحب کی بیان کردہ پہلی روایت کو قرین قیاس سمجھ کر قبول کر لیا۔ حالانکہ انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ کاتب صاحب نے اپنے بیانات کا کوئی حوالہ نہیں دیا، اور اس کی بعض روایتیں صریح تاریخی واقعات کے خلاف پائی جاتی ہیں۔ مگر لکھتے ہیں :

"تاہم داتا صاحب کے سلطان کی فوج میں آنے کی بات دل کو لگتی ہے۔ مسعود نے ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں ہانسی پر حملہ کیا تھا۔ بہت ممکن ہے اس لشکر کے ساتھ ہمارے ممدوح ملتان اور پھر پہلی مرتبہ لاہور آئے ہوں[۵]"

مولانا ہاشمی نے ایک بے سند روایت کو کیوں قبول کیا ؟ اس کی انھوں نے کوئی وجہ تو نہیں بتائی، لیکن اس کے حق میں دلائل تلاش کرنے میں بڑی محنت کی ہے

آقائے حبیبی نے ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء کے بعد داتا صاحب کا لاہور میں قیام ظاہر کرنے کے لئے نہایت عجیب دلائل کا سہارا لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ : داتا صاحب نے کشف المحجوب میں شیخ المشائخ "ابوسعید ابوالخیر" کے نام کے ساتھ دعائے خیر کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کشف المحجوب کی تصنیف کے وقت رحلت فرما چکے تھے۔ ان کی رحلت ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں ہوئی تھی اور چونکہ ہجویری علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب کشف المحجوب لاہور میں لکھی ہے۔

"بنابریں ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ موصوف ۴۴۰ھ کے بعد لاہور میں رہ چکے ہیں۔"

آقائے حبیبی مزید لکھتے ہیں کہ کشف المحجوب کی تحریر کے وقت شیخ ابوالقاسم

گرگانیؒ بقیدِ حیات تھے اور ہجویری نے طوس میں ان سے ملاقات کی تھی۔ گرگانی رح موصوف نے ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا " لہٰذا ہم اس نتیجے پر

پہنچتے ہیں کہ ہجویریؒ ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء کے بعد لاہور میں مسکون تھے۔ اور کشف المحجوب کی تصنیف میں مشغول تھے۔"

ان دونوں واقعات سے داتا صاحب کے لاہور میں مقیم ہونے کا حکم لگانا ایسی بات ہے کہ حقائق اس کی تصدیق نہیں کرتے۔

داتا صاحبؒ کا اپنا بیان

داتا صاحبؒ کرامت اولیاء کے ضمن میں ایک ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ ایک مرتبہ میہنہ میں شیخ ابو سعیدؓ کی تربت پر اپنی عادت کے مطابق تنہا بیٹھے تھے کہ ایک سفید کبوتر اڑتا ہوا آیا اور مزار کے غلاف میں گھس گیا۔ داتا صاحبؒ نے ... غلاف اٹھا کر دیکھا تو کبوتر غائب تھا۔ اس سے اگلے روز بھی یہی واقعہ پیش آیا تو داتا صاحب حیران ہوئے۔ آخر ایک رات خواب میں شیخ ابو سعیدؒ نے انکشاف کیا کہ وہ کبوتر ان کے معاملہ کی صفائی ہے جو روزانہ ہم نشینی کے لئے آتا ہے۔ شیخ ابو سعید کا انتقال، ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ کبوتر والا واقعہ ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء کے بعد کا ہے اور اس زمانہ میں داتا صاحب میہنہ میں مقیم تھے جو خراسان کا ایک گاؤں ہے۔ نیز گدڑی پہننے کی شرائط میں لکھا ہے:

" میں نے کہ علی بن عثمان الجلابی ہوں، طوس میں شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ سے استفسار کیا کہ درویش کو فقر کا سزاوار بننے کے لئے کیا لازم ہے ...."

شیخ ابوالقاسم گرگانیؒ کا انتقال ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں ہوا تھا۔ ان دونوں واقعات

سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء اور ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء کے درمیانی عرصہ میں داتا صاحب خراساں میں تعلیم کے مراحل طے کر رہے تھے۔ اس کے بعد ایک اور واقعہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک دفعہ میں اپنے شیخ کے ساتھ آذربائیجان میں جا رہا تھا کہ دو تین گدڑی پوشوں کو دیکھا، وہ گیہوں کے ڈھیر پر، دامن پھیلائے کھڑے تھے۔ شیخ نے ان کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی (ترجمہ) یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی خریدلی۔ پس ان کی تجارت کچھ نفع مند نہ ہوئی اور دراصل وہ ہدایت پانے والے نہ تھے"[9]

اپنے مرشد کے سوانحی خاکے میں داتا صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ اپنے شیخ حضرت ابو الفضل محمد الحسن الختلی کی رحلت کے وقت ان کے سرہانے موجود تھے اور انھوں نے اپنا سر داتا صاحب کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ شیخ کی وفات بیت الجن میں ہوئی۔ جو داتا صاحب کے بقول بانیان اور دمشق کے درمیان واقع ہے[10]۔ حضرت الختلی کا سال وفات ۴۶۰ھ/۶۸-۱۰۶۷ء ہے۔

پس ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء اور ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء کے درمیان داتا صاحب خراسان میں تھے اور ۴۵۰/۱۰۵۸ء اور ۴۶۰ھ/۶۸-۱۰۶۷ء کے درمیان آذربائیجان اور شام کی سیاحت فرما رہے تھے لہذا زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ آپ ۴۶۰ھ/۶۸-۱۰۶۷ء میں اپنے مرشد کی وفات کے بعد ہی لاہور میں تشریف لائے ہوں گے۔

لاہور میں دوبارہ آئے ؟

مولوی محمد شفیع مرحوم کی رائے بھی یہی ہے کہ داتا صاحب ۴۶۰ھ کے بعد

لاہور آئے ہوں گے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اگر داتا صاحب کے محمودی لشکر کے ساتھ لاہور آنے کے متعلق "خلاصۃ التواریخ" کی روایت درست ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ داتا صاحب ایک سے زیادہ دفعہ یہاں تشریف لائے[۱۱]۔ غالباً یہی بات مولانا ہاشمی مرحوم کے ذہن میں تھی کہ سلطان مسعود کے ساتھ لاہور آنے کے بارے میں ایک کاتب کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ داتا صاحب دو مرتبہ لاہور آئے ہوں گے۔ ان کے الفاظ ہیں:

> "داتا صاحب غالباً سلطان مسعود اول کی ہانسی پر لشکر کشی میں ملتان اور پہلی مرتبہ لاہور آئے۔ مگر مستقل سکونت بہت عرصے کے بعد اختیار کرنے کی نوبت آئی ہوگی۔ کیونکہ سالہا سال تک وسط ایشیا کے مختلف ممالک میں سیاحت کرتے رہے[۱۲]۔"

کسی ٹھوس شہادت یا واضح اشارہ کی عدم موجودگی میں داتا صاحب کے دو مرتبہ لاہور آنے کی روایت قابلِ قبول نہیں۔ ترجیح اسی رائے کو حاصل ہے کہ داتا صاحب ۴۶۰ھ / ۶۸-۱۰۶۷ء کے بعد لاہور تشریف لائے تھے۔

سلطان المشائخ کی روایت

داتا صاحب کے لاہور میں وُرُود کے بارے میں سب سے پرانی اور مقبول روایت وہ ہے جسے سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ نے بیان فرمایا تھا۔ یہ روایت "فوائد الفواد" میں ۲۹ ذی قعدہ ۷۰۸ھ بمطابق ۱۰ مئی ۱۳۰۹ء کی ایک مجلس میں یوں آئی ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا:

> "شیخ علی ہجویری اور شیخ حسین زنجانیؒ ایک ہی مرشد سے بیعت تھے۔ شیخ حسینؒ مدت سے لاہور میں فروکش تھے۔ ایک روز

مرشد نے شیخ علیؒ کو لاہور جانے کا حکم دیا۔ انھوں نے کہا کہ وہاں
نو زنجانیؒ موجود ہیں۔ پھر ارشاد ہوا کہ تم جاؤ۔ چنانچہ وہ روانہ ہو
گئے۔ رات کے وقت لاہور پہنچے۔ اسی رات حسین زنجانی
کا انتقال ہوا، اور صبح ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔"[۱۳]

"فوائد الفواد" حضرت نظام الدین اولیاء (وفات ۲۵۔۵۔/۷۲۵ھ) کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے ایک محبوب خلیفہ میر حسن علاء سجزیؒ نے مرتب کیا۔ اس مجموعہ کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ امیر خسروؒ رشک کے ساتھ فرمایا کرتے تھے "کہ کاش میری تمام تصنیفات حسنؒ کے نام سے ہوتیں اور یہ ایک میرے نام سے[۱۴]"۔

سلطان المشائخؒ نے یہ روایت کس سے سنی ؟ اس کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کو لاہور سے بھی نسبت تھی۔ وہ یوں کہ آپ کے دادا خواجہ علی بخاریؒ اور نانا خواجہ عرب صاحبؒ جب بخارا سے وارد ہند ہوئے تو لاہور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد بدایوں گئے تھے[۱۵]۔ ان کا زمانہ داتا صاحب سے نزدیک ٹھہرتا ہے۔ غالب گمان ہے کہ انھوں نے بزرگان لاہور سے جو باتیں سنی تھیں، اپنے بیٹوں۔ پوتوں نواسوں کو سنائی ہوں گی[۱۶]۔ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے لاہور کے متعلق اور روائتیں بھی بیان کی تھیں۔ خواجہ صاحب کے یہ ارشادات اخیر عمر کے ہیں۔

"فوائد الفواد شروع اس وقت ہوئی جب شیخ کی عمر ستر برس سے
متجاوز ہو چکی تھی اور بند اس وقت ہوئی جب شیخ کی وفات کو
کل دو ڈھائی سال رہ گئے تھے[۱۷]۔"

مولانا ہاشمی مرحوم نے اس شبہے کا اظہار کیا ہے کہ داتا صاحب کے شیخ زنجانیؒ کے انتقال کے دن لاہور آنے کی روایت بعد کا اضافہ ہے۔ لکھتے ہیں :

"واضح رہے کہ فوائد الفواد قبولِ عام کی وجہ سے قرونِ گزشتہ

میں کثرت سے نقل ہوتی رہی ہے اور اس لئے بھی الحاقات
سے محفوظ نہیں سمجھی جاسکتی۔ اگرچہ اسکی یہ عبارت شروع
گیارھویں صدی میں "ثمرات القدس" کے تالیف ہونے کے
وقت موجود تھی اور ثمرات میں نقل کی گئی ہے۔ اس کے
سوا کسی دوسرے قدیم تذکرے میں نہیں آئی[۱۸]"

نیز یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ داتا صاحب اپنے مرشد کی رحلت کے وقت انکے سرہانے موجود تھے۔ ان کے آخری الفاظ مسئلہ اعتقاد کے بارے میں تھے جنھیں داتا صاحب نے کشف المحجوب میں محفوظ کر دیا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ مرشد نے اس سے زیادہ کوئی وصیت نہ کی[۱۹]۔ ان آخری الفاظ میں لاہور جانے کا کوئی ذکر نہیں۔ مولانا ہاشمی نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ "کشف المحجوب" میں بیسیوں معاصرین کا ذکر ہے۔ شیخ حسین زنجانی ؒ کا نام کہیں نہیں لکھا۔ البتہ آذر بائیجان کے ایک بزرگ شیخ شفیق فرخ معروف بہ اخیہ زنجانی ؒ کا محبت و عقیدت سے ذکر کرتے ہیں۔ نفحات الانس میں ان کی وفات ۵۷ھ/۱۰۶۵ء بتائی گئی ہے۔ شیخ حسین زنجانی ؒ چھٹی صدی ہجری کے اواخر یعنی داتا صاحب سے کوئی ڈیڑھ سو برس بعد کے بزرگ ہیں[۲۰]۔"

حضرت داتا صاحب اور شیخ حسین زنجانی ؒ کی معاصرت کے خلاف کئی شواہد موجود ہیں۔ 'آئین اکبری' میں شیخ زنجانی ؒ اور خواجہ معین الدین چشتی ؒ کی لاہور میں ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے اور سال وفات ۶۰۰ھ/۱۲۰۳ء یا کچھ بعد لکھا ہے[۲۱]۔ داراشکوہ نے بھی "سفینۃ الاولیاء" میں حضرت معین الدین چشتی ؒ کے حالات میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ جب خواجہ اجمیری ؒ لاہور تشریف لائے تو شیخ حسین زنجانی ؒ سے ملاقاتیں کیں[۲۲]۔ "خزینۃ الاصفیاء" کے مطابق خواجہ اجمیری کی لاہور میں سید یعقوب زنجانی ؒ المعروف بہ صدر دیوان سے بڑی محبت و الفت ہوگئی۔ سید یعقوب کے مزار سے متصل خواجہ اجمیری کی نشست گاہ باقی ہے[۲۳] ۔۔۔

"تحقیقات چشتی" میں بھی یہی روایت درج ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ سید یعقوب زنجانی اپنے تین ساتھیوں یعنی شیخ المشائخ حسین زنجانیؒ۔ سید اسحاق زنجانیؒ اور شیخ علی لاحقؒ (مدفون سیالکوٹ) کے ہمراہ ۵۵۷ھ/۱۱۶۲ء میں لاہور آئے اور بعد ازاں جب خواجہ اجمیر تشریف لائے تو ان بزرگوں سے باہم صحبتیں رہیں۔[۲۴]

اگرچہ شیخ حسین زنجانیؒ کے سالِ وفات کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے مگر مذکورہ واقعات سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ جناب حسین زنجانی لاہور میں داتا صاحب کے پیش رو نہ تھے بلکہ سید یعقوب زنجانی (المتوفی ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء) اور خواجہ معین الدین چشتی (وفات ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء) کے معاصر تھے۔ آقائے حبیبی نے اپنے مقالہ "تاریخ وفات داتا گنج بخش" میں اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خزینۃ الاصفیا" میں حسین زنجانی کی رحلت کا سال ۶۰۰ھ/ ۱۲۰۳ء قرار دیا گیا ہے جو اس وجہ سے غلط ہے کہ فوائد الفواد کی روایت کے خلاف ہے"۔[۲۵]

"آئین اکبری۔ سفینۃ الاولیاء، خزینۃ الاولیاء اور مولوی شفیع (مقالات علمی جلد اول ص۲۱۵) کی شہادتوں کے مقابلے میں حبیبی کا جذباتی اور بے سند قول، چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔

ناگوار قیام

داتا صاحبؒ کے اپنے مرشد کے حکم پر لاہور آنے کے حق میں 'کشف المحجوب' کی یہ عبارت پیش کی جاتی ہے: کہ

"فی الوقت اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں کیونکہ میری کتابیں غزنین اللہ اسکی حفاظت کرے، میں رہ گئی ہیں اور میں یہاں

دیارِ ہند میں ناجنسوں کے درمیان پھنسا ہوں۔"[۲۶]

نکلسن نے (دیباچہ X) درمیان ناجنساں گرفتار شدہ کا مفہوم یہ لیا ہے کہ داتا صاحب "گرفتار" کر کے لاہور لائے گئے تھے۔ غالباً نکلسن کے اتباع میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ چونکہ داتا صاحب نے لاہور کا ذکر ناگواری کے ساتھ کیا ہے لہذا ضرور اپنی مرضی کے خلاف اور مرشد کے حکم کی مجبوری کے باعث تشریف لائے ہوں گے۔[۲۷] اگر یہ بات درست ہوتی کہ داتا صاحب اپنے مرشد کے حکم پر لاہور آئے تھے تو بھی ان جیسے ولی اللہ سے یہ امید نہ کرنی چاہیئے کہ اپنے مرشد کے حکم پر ناک بھوں چڑھاتے۔

داتا صاحب کے پیشرو

غالباً خلاصۃ التواریخ کے اتباع میں بعض سوانح نگاروں نے کہا ہے کہ داتا صاحب پہلے مبلغ تھے جو سرزمین لاہور میں وارد ہوئے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ شیخ حسین زنجانیؒ داتا صاحب سے پہلے کے نہیں بعد کے بزرگ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ داتا صاحب سے پہلے کون کون سے بزرگ ارض لاہور میں تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے چکے تھے؟ اس سوال کے جواب میں اپنی بے مائیگی کا اقرار کئے بغیر نہیں بنتی۔ ہماری محدود اطلاعات کے مطابق لاہور میں جس اولین عالم کی موجودگی ثابت ہوتی ہے وہ "ابوالفتح عبدالصمد بن عبدالرحمن اشعثی لوہوری (لاہوری) ہیں جنھوں نے سمرقند میں علم حاصل کیا اور ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء میں لاہور میں وفات پائی۔ آپ کا تذکرہ سمعانی نے 'کتاب الانساب' میں کیا ہے۔"[۲۸]

مولانا ریاست علی ندوی نے شایان اسی زمانے کے ایک اور بزرگ کی اطلاع دی ہے:-

"شیخ ابوالمنصور بن علی غزنوی کہ جو ممتاز اہل علم میں سے تھے۔

سلطان مسعود غزنوی نے ۴۲۶ھ/ ۳۵-۱۰۳۴ء میں
ہندوستان بھیجا، لاہور میں قیام تھا۔ انہیں دیوان الانشا
کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا۔[۲۹]

ہم ان دونوں بزرگوں سے زیادہ شیخ اسمٰعیل بخاریؒ سے واقف ہیں۔ اگرچہ آپ ان دونوں بزرگوں سے پہلے ۳۹۵ھ/ ۱۰۰۴ء میں لاہور آئے تھے مگر وفات ابوالفتح کے انیس سال بعد ۴۴۸ھ/ ۱۰۵۶ء میں ہوئی۔ "تذکرہ علمائے ہند" کے مطابق شیخ اسمٰعیلؒ پہلے بزرگ تھے جن کی بدولت تفسیر و حدیث کا علم لاہور میں پہنچا۔[۳۰] "خزینۃ الاصفیا" اور "تحقیقات چشتی" میں ان کے شاندار تبلیغی کارناموں کا ذکر ملتا ہے۔ مولوی نور احمد چشتی نے ہال روڈ لاہور پر ان کے مزار کی نشان دہی کی ہے[۳۱]
مولانا ہاشمی کا یہ خیال توجہ چاہتا ہے کہ:

"ایک روایت کے مطابق داتا صاحب محمود سے قبل لاہور آئے اور انہی کی تحریک سے سلطان نے اس شہر کو تسخیر کیا۔ ممکن ہے کہ اصل میں اس روایت کا تعلق ان بزرگ (شیخ اسمٰعیل) سے ہو اور عین ممکن ہے کہ یہ وہی بزرگ ہوں جنکا ذکر داتا صاحب نے تذکرہ معاصرین غزنوی میں ان الفاظ میں کیا ہے — "و شیخ مجرد از خلائق مفرد اسمٰعیل الشاشی پیرے محتشم بود و بر طریق ملامت رفتے"۔ بخاری اور شاشی ہونے میں کچھ تناقض نہیں ہے۔ اسی طرح داتا صاحب کی مثل ان کا غزنوی ہونا اور آخر میں لاہور آجانا کچھ تباعد نہیں رکھتا"۔[۳۲]

داتا صاحب کے زمانہ میں لاہور میں دیگر علماء کی موجودگی اور لاہور میں مسجدوں کی کثرت کا ثبوت دارا شکوہ کی اس روایت سے بھی ملتا ہے کہ جب داتا صاحب نے ایک

مسجد تعمیر کرائی تو اس کا رُخ قبلہ دوسری مساجد کی نسبت جنوب کیطرف جھکا ہوا تھا۔ اس پر علمائے وقت نے اعتراض کیا۔ داتا صاحب نے معترضین کو اپنی مسجد میں جمع کیا۔ امامت فرمائی، تمام حجابات درمیان سے اٹھ گئے اور سامنے کعبہ نظر آنے لگا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ داتا صاحب سے پہلے مساجد موجود تھیں تو علماء بھی ضرور ہوں گے!

باب ۴

داتا صاحب کے عہد کا لاہور

****

کفرستانِ ہند میں پاکستان قائم کرنے کی مساعی کا آغاز خلافت راشدہ کے زمانہ میں ہوا تھا۔ ابوالعاص ثقفی کے فرزند حضرت عثمانؓ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے طائف کا حاکم مقرر فرمایا تھا۔ انہوں نے خلافتِ فاروقی کی ابتداء میں ۱۵ھ/۶۳۶ء یا اس کے بعد بحرین کی امارت ولایت پر فائز ہونیکے بعد اپنے ایک بھائی حضرت حکم بن ابی العاصؓ کو تھانہ (بمبئی)، اور بھڑوچ پر لشکر کشی کے لئے بھیجا، اور دوسرے بھائی حضرت مغیرہ بن ابی العاصؓ کو دیبل (کراچی)، کی مہم پر بھیجا۔ جب یہ مہم جو فتحیاب واپس آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی تو خفا ہوئے۔ حضرت عثمان بن ابی العاص کو لکھا:

> "اے ثقفی! تو نے گویا کیڑے کو لکڑی پر سوار کر کے سمندر کے حوالے کر دیا ہے۔ خدا کی قسم اگر مسلمانوں پر کوئی آفت آئی تو میں تمھارے قبیلے سے اسکا بدلہ لوں گا۔"

یوں یہ سلسلہ جہاں کا تہاں رُک گیا۔ اس کے دو سال بعد ۱۷ھ/۶۳۸ء میں حضرت عمر فاروقؓ نے سلطنت فارس سے فیصلہ کن ٹکر کے لئے امیر بصرہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو ہدایات جاری کر کے حضرت سہیل بن عدیؓ کی جنرل کمان میں سات فوجیں

ترتیب دی۔ ان کے سات امیر مقرر کئے جنہوں نے بیک وقت مختلف علاقوں پر چڑھائی کر دی۔ مکران کے محاذ کی کمان حضرت حکم بن عمرو ثعلبی رضؓ کے سپرد تھی۔ انہوں نے ۲۱ یا ۲۳ھ/ ۴۲-۴۱ ۶ء یا ۴۴-۶۴۳ء میں کاروائی شروع کی۔ سندھیوں نے مکرانیوں کی بھرپور مدد کی مگر شکست کھائی۔ اور میدان سے بھاگ گئے۔ مکران کی فتح کی خوشخبری مال غنیمت کے خمس کے ساتھ حضرت صحار عبدی رضؓ کے ہاتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو پہنچائی۔ اس محاذ کی مشکلات سننے کے بعد فاروق اعظم رضؓ نے مکران سے آگے بڑھنے کی ممانعت کر دی[1]۔ حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں سنہ ۴۴ھ/ ۶۶۴ء میں مہلب بن ابی صفرہ نے موجودہ صوبہ سرحد پر چڑھائی کی اور پیش قدمی کرتے ہوئے بنہ (بنوں) اور الاہوار (لاہور واقع صوبہ سرحد) تک جا پہنچے[2]۔ بہرحال یہ فتح عارضی ثابت ہوئی۔

پہلی صدی ہجری کے آخری چند سالوں میں محمد بن قاسم کے زیر قیادت اسلامی فتوحات اتنی مشہور ہیں کہ ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ محمد بن قاسم نے ۹۵-۹۴ھ/ ۱۳-۷۱۲ء میں ملتان کو فتح کیا مگر سندھ کی نئی اسلامی مملکت میں توسیع کا سلسلہ یہیں رک گیا۔ یوں سرحد اور پنجاب اسلامی انقلاب سے نا آشنا رہے تاآنکہ محمود غزنوی نے گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پنجاب اور سرحد کو اسلامی مملکت کے حدود میں شامل کر لیا۔

پنجاب کا سیاسی نقشہ

داتا صاحب سے پہلے یا ان کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں پنجاب اور سرحد کئی سیاسی اکائیوں میں منقسم تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں سب سے بڑی ریاست ویہند تھی جہاں پر جے پال حکمران تھا۔ اس ریاست کی سرحد جہلم یا چناب پر ختم ہو جاتی تھی[3]۔

کوہستانِ نمک میں ایک اور چھوٹی سی ریاست تھی جسکا صدر مقام چکوال کے نزدیک نندنہ یا نندونہ تھا۔ جے پال کے بیٹے انند پال نے ویہند میں محمودی لشکر سے شکست کھانے کے بعد نندونہ کو اپنا مرکز بنایا۔ اسکے بیٹے ترلوچن پال سے محمود نے نندونہ کا قلعہ بھی چھین لیا۔[۸]

کوہستانِ نمک کے دوسری طرف بھیرہ کی ریاست تھی۔ جسکا حکمران بجی رائے تھا۔ وہ بھی محمودی یلغار کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ چناب اور بیاس کے درمیان ایک گمنام سی مملکت تھی جسے البیرونی نے ریاست لہاور کا نام دیا ہے اور دریائے راوی کے کنارے واقع مندھ کور کو اس کا صدر مقام بتایا ہے۔[۹] بیاس کے پار جالندھر کی ریاست تھی جسکے حکمران کا نام رائے پورہ بتایا جاتا ہے۔ شمال میں کشمیر کی ریاست تھی جس پر سنگرام راج حکومت کرتا تھا۔ محمود نے دو کوششوں کی ناکامی کے بعد تسخیر کشمیر کا خیال دل سے نکال دیا۔[۸]

جنوب میں ملتان اور منصورہ کی اسلامی ریاستیں تھیں۔ ملتان میں آل سامہ کے محمد بن قاسم بن منبہ نے ۲۷۹ھ اور ۲۸۶ھ / ۸۹۲ء اور ۸۹۹ء کے درمیان اپنی حکومت قائم کی تھی۔[۹] جسے داتا صاحب سے ذرا ہی پہلے ۳۶۰ھ اور ۳۷۵ھ / ۹۷۰ء اور ۹۸۵ء کے درمیان قرمطی داعی جلم بن شیبان نے ہتھیا لیا تھا۔[۱۰] بیرونی نے تصدیق کی ہے کہ وہ شیعی تھا اور اس نے بنو امیہ کے دور کی جامع مسجد بغض معاویہؓ میں بند کرا دی تھی —— محمود غزنوی کے وقت ملتان پر ابوالفتح داؤد بن نصر بن حمید باطنی حکمران تھا۔ محمود نے اسے ۴۰۱ھ / ۱۰۱۰ء میں شکست دے کر ملتان میں اہلسنت کی حکومت دوبارہ قائم کر دی۔[۱۱] —— منصورہ (ضلع سانگھڑ میں شہدا دپور سے ۱۱ میل دور اس کے کھنڈر برآمد ہو گئے ہیں) میں ہباری خاندان کی حکومت تھی جو مقدسی کے بقول سُنّی تھے مگر ۴۱۶-۱۷ھ / ۲۵-۲۶-۱۰۲۵ء میں محمود غزنوی نے سومنات سے واپسی پر حاکم منصورہ کو مرتد قرار دیکر اسکی حکومت چھین لی۔[۱۲]

یوں محمود غزنوی نے سرزمینِ ہند میں جو نئی مملکت قائم کی اس کا نقشہ پاکستان کے موجودہ

174-175

نقشہ کے عین مطابق تھا

پنجاب کا پرانا نام

محمود غزنوی نے پنجاب کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے بالآخر ۴۱۳ھ/۱۰۲۲ء میں اسے غزنی میں شامل کر کے ایک متحدہ صوبے کی حیثیت دے دی[۱۳] اور عبداللہ قراتگین کو پہلا سالار یا صوبیدار مقرر کیا[۱۴]، اور موجودہ لاہور کو اس صوبے کا صدر مقام قرار دیا۔

عام خیال ہے کہ اس خطے کو پنجاب کا نام مسلمانوں نے دیا تھا[۱۵]۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے نام کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ پہلی تا چوتھی صدی عیسوی کے درمیان کے ایک ہندو مصنف نے اس علاقہ کے لئے پانچ دریاؤں کی سرزمین کا نام استعمال کیا ہے[۱۶]۔ البیرونی نے بھی اسے پانچ دریاؤں کی سرزمین لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ملتان کے نزدیک جہاں پانچوں دریا ملتے ہیں اسے مقامی زبان میں پنجند کہتے ہیں[۱۷]۔ یہی پنجند فارسی میں پنجاب بن گیا۔

لاہور تھا کہ نہیں تھا

اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لاہور کیسا شہر تھا جس میں داتا صاحب نے علامہ اقبالؒ کے بقول اپنے جمال سے عہد فاروق رضؓ کو زندہ کر دیا تھا۔ اس شہر میں کیسے لوگ بستے تھے، جن کی اصلاح و تہذیب کے لئے داتا صاحب ساری دنیا چھوڑ کر یہاں آن بسے تھے۔ ان لوگوں کے شب و روز کیسے گزرتے تھے جن میں بیٹھ کر داتا صاحب نے کشف المحجوب جیسی کتاب لکھی۔

ان سوالوں کا واضح جواب معلوم کرنا محال ہے۔ ایسا تاریخی مواد جس سے اس زمانے کی حقیقی تصویر کھینچی جا سکتی تھی ضائع ہو چکا ہے یا ابھی تک ہماری نگاہوں سے

اوجھل ہے۔ یہاں تک کہ داتا صاحب کے زمانے سے پہلے لاہور کا وجود اور عدم وجود ما بہ النزاع ہے!

رام چندر کے بیٹے سے نسبت!

عام روایت ہے کہ لاہور کو راجہ رامچندر کے بیٹے لو نے آباد کیا تھا۔ سبحان رائے بٹالوی نے اسے قبول کر کے تاریخی سند عطا کر دی[18]۔ کرنل ٹاڈ (۱۸۲۹ء) نے کہا کہ لاہور کی بنیاد رام کے بیٹے لوہ نے رکھی تھی[?] اور پرانے زمانے میں لاہور کو لوہ کوٹ کہتے تھے میواڑ کے راجے اسی لوہ کوٹ کے راجاؤں کی اولاد ھیں جو ۱۲۵ء میں نقل مکانی کر کے دوارکا آئے تھے[19]۔

جسٹس ٹی ایچ تھارنٹن نے لاہور کا سراغ مشہور یونانی جغرافیہ دان بطلیموس (نواح ۱۶۱ء) سے لگایا کہ اس نے لکھا تھا:

"باختر سے پاٹلی پتر کو جانے والے راستے پر لبوکلا نامی شہر آباد ہے۔ یہ لبوکلا — لاہور ہے۔ لبو، لو کی بگڑی ہوئی شکل ہے[20]"

اس طرح لاہور کو ویدک زمانے کا شہر قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لاہور کی قدامت کے ضمن میں، مسلم مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں کے حوالے بھی پیش کئے جاتے ہیں مثلاً بلاذری نے صوبہ سرحد پر مہلب بن ابی صفرہ کی مہم کا ذکر کرتے ہوئے "الاہوار" کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ملتان اور کابل کے درمیان واقع ہے[21]۔ "حدود العالم" کے نامعلوم مؤلف نے لکھا ہے کہ لہور بہت بڑا شہر ہے — ملتان کے تحت ہے اور بازار اور مندر بہت ہیں جوز ہندی۔ بادام اور چلغوزہ کے درختوں کی بہتات ہے[22] اور یاقوت الرومی نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے شہروں میں لاہور بہت بڑا شہر ہے[23]۔

سرحد کے لاہور سے التباس

اس کے برعکس دسویں صدی عیسوی سے پہلے لاہور کے وجود سے انکار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ سٹرابو نے ۶۰ ق م اور ۱۹ء کے درمیان لکھتے ہوئے لاہور کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ پلینی نے ۲۳ء اور ۷۹ء میں سندھ اور الہ آباد کے مابین منازل کا حال لکھا ہے مگر ان میں لاہور کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ سکندر نے موجودہ لاہور کے کہیں قریب سے ہی دریائے راوی کو عبور کیا تھا مگر اس کے مؤرخین نے بھی لاہور کا ذکر نہیں کیا۔ چینی سیاح ہیونتسانگ نے ۶۳۰ء میں پنجاب کی تفصیلی سیاحت کی تھی۔ اس نے پنجاب کے کئی شہروں کا حال لکھا ہے۔ مگر لاہور کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بطلیموس نے باختر سے پاٹلی پتر (پٹنہ) جانے والی شاہراہ پر واقع جس شہر لبوکلا کا ذکر کیا ہے۔ اس کا محلِ وقوع کیسپیریا (کشمیر) کے علاقہ میں قرار دیا ہے لہذا لبوکلا کا اطلاق موجودہ لاہور پر نہیں ہوتا۔

اسی طرح اگر مسلم مؤرخوں اور جغرافیہ نویسوں کے بیانات کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ البلاذری کا الاہوار موجودہ لاہور نہیں کیونکہ اس نے واضح کر دیا ہے کہ الاہوار ملتان اور کابل کے درمیان ہے۔ اس زمانے میں کابل سے براستہ ڈیرہ غازی خاں ملتان جاتے تھے۔ اس راستے میں وہ لاہور ضرور آتا ہے جو ضلع مردان میں ہُنڈ کے نزدیک واقع ہے۔ مہلب بن ابی صفرہ کے حملہ کے سلسلہ میں الاہوار کا ذکر بنہ (بنوں) کے ساتھ آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صوبہ سرحد والا لاہور ہی ہوگا ــــــ اسی طرح "حدود العالم" والے لہور میں اخروٹ، بادام اور چلغوزہ کے درختوں اور مندروں کی بہتات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ پنجاب کے لاہور کا نہیں سرحد کے لاہور کا ذکر ہے۔ البیرونی نے دریائے سندھ کے منبع اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں کے ذکر میں

لہاور کا محل وقوع صوبہ سرحد میں متعین کر دیا ہے۔[۲۴]

لاہور : ایک ریاست

البیرونی نے "کتاب الہند" میں مختلف راستوں اور منازل کا ذکر کیا ہے وہ قنوج سے غزنہ کے راستے میں مختلف پڑاؤ اور ان کے درمیانی فاصلے لکھتا ہوا اسنام تک آتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہاں (اسنام) سے شمال مغرب کیطرف چلیں تو اداتاہور پہنچتے ہیں جو نو فرسخ ہے۔ وہاں سے جہانیر چھ فرسخ ہے اور وہاں سے مندھکور آٹھ فرسخ ہے جو دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر ہے اور لہاور کا دارالحکومت ہے۔ وہاں سے دریائے چناب بارہ فرسخ۔ جہلم آٹھ فرسخ گندھارا کا صدر مقام ویہند جو سندھ کے مغربی کنارے پر ہے۔ بیس فرسخ اور وہاں سے پشاور چودہ فرسخ ہے[۲۵]

یوں ہمیں پہلی بار پنجاب میں واقع لاہور کا ذکر ملتا ہے لیکن ایک شہر کی حیثیت میں نہیں بلکہ ایک ریاست کے طور پر — بیرونی نے اسکے صدر مقام کا نام مندھکور بتایا ہے اور بیہقی نے مندکور — مولانا ہاشمی نے ان ناموں کو منڈی کھوکھر کی معرب شکل قرار دیا ہے[۲۶]۔ کتاب الہند کے مترجم زخاؤ نے لکھا ہے کہ بیرونی نے "قانون مسعودی" میں مندکور کو ایک قلعہ بتایا ہے۔ (صفحہ ۷۰،۷۴)

مندھکور سے محمود پور

مندکور موجودہ لاہور کے آس پاس واقع تھا۔ مضار نٹن نے سیالکوٹ کے نزدیک مان کوٹ کو مندھکور بتایا ہے لیکن خان ولی اللہ خاں نے واضح کیا ہے کہ سیالکوٹ کے نزدیک مان کوٹ نام کا کوئی مقام ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ البیرونی نے — مندھکور کا عرض بلد خود معلوم کیا جو ۵۰َ ۳۱ْ ہے اور یہ موجودہ لاہور کے عرض بلد کے مطابق

ہے اور دونوں میں صرف سولہ منٹ کا فرق ہے لہذا مندھکور کے آثار یہیں کہیں ہونے چاہئیں۔ خان ولی اللہ خاں کا خیال ہے کہ شاید البیرونی کا مندھکور قدیم منڈا والا (مُندریاں والا) ہو جو موجودہ لاہور سے بارہ میل جنوب مغرب میں راوی کے غربی کنارے پر واقع ہے اور قدیم روایات وہاں ایک معدوم قلعے کا سراغ دیتی ہیں[۲۷]۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ پنجاب کے دریاؤں کی گزرگاہیں مشرق سے مغرب کی طرف ہٹتی رہی ہیں[۲۸] لہذا مندھکور کو راوی کے مغربی کنارہ پر نہیں بلکہ مشرقی کنارے پر تلاش کرنا چاہیئے۔

غزنویوں نے مندھکور کے نامانوس نام کو بدل کر محمود پور کر دیا[۲۹]۔ لاہور کے عجائب گھر میں محمود غزنوی کی رحلت سے دو سال پہلے ۴۱۹ھ/۱۰۲۸ء میں لاہور کے ٹکسال میں مضروبہ درہم موجود ہے جس پر محمود پور کا نام صاف لکھا ہے لیکن یہ نیا نام بھی زبان زدِ عام نہ ہو سکا اور محمود کے پوتے مودود المتوفی ۴۴۹ھ کے دور میں متروک ہو گیا ـــ اور سکوں پر لوہور مضروب ہونے لگا۔ داتا صاحبؒ کے ورود لاہور کے زمانے میں حکمران ابوالمظفر ابراہیم بن مسعود کے عہد میں لہور لکھا جانے لگا[۳۰] جو موجودہ مقامی تلفظ کے عین مطابق ہے۔

لاہور : دسویں عیسوی کا شہر

البیرونی نے لاہور نام کی ریاست کا ذکر کیا ہے۔ شہروں کے ناموں پر ریاستوں کے نام رکھے جانے کی روایت موجود ہے جیسے ریاست ملتان اور سلطنت منصورہ وغیرہ اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ ریاست لاہور اسی نام کے کسی گمنام شہر سے موسوم ہوگی۔ اور یہی نام زبان زدِ عام ہوگا جس نے سلطان مودود کو مندھکور اور محمود پور کے بجائے یہی مقبول نام لہور اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

مولوی شفیع مرحوم نے اس کی تاریخی سند بھی تلاش کر لی ہے، یہ فخر مدبر کی کتاب "آداب الحرب والشجاعۃ" ہے جو ۶۰۷ھ/ ۱۲۱۰ء میں سلطان شمس الدین التمش کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد لکھی گئی۔ فخر مدبر نے بتایا ہے کہ شہر لوہور کی بنیاد والئے لاہور جج بھندرل نے رکھی۔ اسکا جانشین بیٹا ہرترت لوہور پر پچھتر سال تک حکومت کرنے کے بعد ترانوے سال کی عمر میں مرا۔ اس راجہ نے نئے شہر لاہور میں سورج دیوتا کا بڑا مندر اور ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ یہ مندر وہاں تھا جہاں اب (آداب الحرب کی تالیف کے وقت) مسجد جبشی واقع ہے اور قلعہ کی جگہ پر عرب جمعیۃ کی چھاؤنی بن گئی ہے ——
ہرترت کے بیٹے جیندرت کی ویہند کے راجہ جے پال سے لڑائی چھڑ گئی۔ جے پال نے دوسری لڑائی میں جو ۳۸۹ھ/۹۹۹ء میں ہوئی لوہور پر قبضہ کر لیا۔ جیندرت قید کر لیا گیا مگر اس کے اہل خانہ بھاگ کر جالندھر کے راجہ رلائے پورد کے ہاں پناہ گزین ہوئے انند پال نے لوہور کو ویہند کے ماتحت صوبہ بنا کر اپنے ولی عہد انند پال کو اس کا والی مقرر کیا۔[۳۱]

اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ موجودہ لاہور کی تعمیر دسویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی اسی لئے پرانی تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

لاہور کشف المحجوب میں

لاہور کے ضمن میں داتا صاحب کی ایک عبارت غور طلب ہے۔ کشف المحجوب کے قدیم لاہوری ایڈیشن میں اور نکلسن کے زیر نظر، مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں داتا صاحب کی وہ عبارت جس میں اپنی کتابیں غزنی میں رہ جانے پر افسوس کیا گیا ہے —— یوں مرقوم ہے:

"فی الحال اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں کیونکہ میری کتابیں

غزنی (خدا اُسے محفوظ رکھے) میں رہ گئی ہیں اور میں یہاں
دیارِ ہند میں شہر لہور میں کہ ملتان کے مضافات میں ہے
ناجنسوں کی صحبت میں گرفتار ہوں[۳۲]"

کشف کے روسی ایڈیشن کے متن میں :

" در بلدۂ لہور کہ از مضافات ملتان ہست "

کے الفاظ شامل نہیں ہیں بلکہ حاشیہ میں دوسرے نسخوں کے حوالے سے درج کئے گئے ہیں۔ مولوی شفیع مرحوم کے نسخے میں بھی جسے شیخ بہاء الدین ذکریا نے نقل کیا ہے یہ الفاظ متن میں موجود نہیں ہیں ــــ بلکہ حاشیہ میں ان کا اضافہ کیا گیا ہے[۳۳]۔ ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ حاشیہ شیخ بہاء الدین کا لکھا ہوا ہے یا بعد کا اضافہ ہے ــــ مولانا علم الدین سالک مرحوم اسے سرے سے لاہور ہی نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ لفظ بھنور ہے اور بھنور نامی ایک قصبہ مضافات ملتان میں بے شک موجود تھا[۳۴]۔ اس بحث سے قطع نظر حیرت اس بات پر ہے کہ کیا واقعی داتا صاحب کے زمانے میں لاہور اتنا ہی گمنام تھا کہ اس کا پتہ بتانے کے لئے ملتان کا حوالہ دینا ضروری خیال کیا گیا؟ ــــ تاریخی حقائق اس بات کی تائید نہیں کرتے، حتیٰ کہ اگر داتا صاحبؒ ۴۳۱ھ/۱۰۳۹ء میں بھی تشریف لائے ہوں تب بھی یہ خیال درست ثابت نہیں ہوتا

لاہور کا غزنی سے تعلّق

لاہور کی سیاسی، انتظامی اور تہذیبی اہمیت پر بحث سے پہلے ایک نظر غزنی کی سیاست پر ڈال لینی چاہیئے تاکہ آئندہ مباحث کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ داتا صاحبؒ کے زمانۂ حیات میں غزنی کے تخت پر گیارہ بادشاہ بیٹھے جن میں سے صرف چھ کو صحیح معنوں میں بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔ باقی پانچ ایسے ہیں کہ انہیں ایک سال سے

زیادہ عرصہ تک تخت پر بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ انہی محلاتی سازشوں کا نتیجہ تھا کہ داتا صاحب کی پیدائش کے زمانہ میں جو خود مختار سلطنت غزنی میں قائم ہوئی تھی، وہ ان کی رحلت کے وقت تخت نشین بادشاہ کے ساتھ ہی زوال کا شکار ہو گئی۔

لاہور: غزنویوں کی پناہ گاہ!

سلطان محمود غزنوی نے تینتیس برس حکومت کرنے کے بعد ۲۳ ربیع الثانی ۴۲۱ھ / ۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء کو انتقال کیا تو ہمدان سے لے کر تھانیسر تک وسیع سلطنت اور اربوں روپے کا خزانہ جانشینوں کے لئے چھوڑ گیا[۳۵]، لیکن ساتھ ہی سراسر جذباتی وجوہ کی بنا پر ایسی خرابی کی بنیاد رکھ گیا جو گھن کی طرح اس کی سلطنت کو چاٹنے لگی — اس کے دو بیٹے محمد اور مسعود ایک ہی دن، دو مختلف ماؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ محمد بزم کا دھنی تھا تو مسعود رزم کا — مسعود کا گرز کسی پہلوان سے بھی نہ اٹھایا جاتا، اور اس کا تیر فولادی چادر کے بھی پار نکل جاتا۔ اس نے نو عمری میں ہی تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ محمود نے اسے اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔

زندگی کے آخری دور میں محمود مسعود سے بدظن ہو گیا اور اس کی ولی عہدی کو منسوخ کر کے "خوش گفتار اور سعادت مند" محمد کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ نئے انتظام کی توثیق خلیفہ سے کرا لی اور اپنے امراء سے بھی۔ محمود کے آنکھیں بند کرتے ہی مرحوم کے محبوب ایاز اور ابو علی دایہ جیسے امیروں نے محمد سے آنکھیں پھیر لیں اور مسعود سے جا ملے رمضان / ستمبر میں خراسان کی فوج نے مسعود کی سلطانی کا اعلان کر دیا۔ محمد مقابلے کو نکلا مگر اس کے امراء نے راہ میں ہی اسے معزول کر کے قید کر دیا اور مسعود کی اطاعت تسلیم کر لی۔ پھر مسعود کے حکم سے محمد کو قید خانہ میں اندھا کر دیا گیا۔ یوں مسعود اسی سال تخت غزنی پر متمکن ہو گیا۔

مسعود تلوار کا دھنی اور شجاعت کا پیکر ضرور تھا، مگر اس بصیرت سے محروم تھا جو صحیح حربی حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے ذریعے فتح کی ضمانت بنتی ہے الٹی سیدھی مہموں اور غلط منصوبہ بندی نے لشکریوں کا مورال گرا دیا۔ سیاسی اور انتظامی امور کو اس کے لائق وزیر خواجہ حسن میمندی نے سنبھال رکھا تھا لیکن تین سال بعد میمندی کی وفات سے وہ اس امداد سے محروم ہو گیا۔ اس وقت سلطنت غزنی کو دو خطرے لاحق تھے۔ مغرب میں سلجوقیوں کا اور مشرق میں ہندوستانی راجوں کا۔ وہ ان خطرات کے مقابلہ کے لئے ترجیحات کے تعین میں ناکام ہو گیا اور اس نے ساری توجہ اور طاقت ہندوستان پر مرکوز کر دی۔ یہاں اس نے ۴۲۹ھ/۳۸-۱۰۳۷ء میں ہانسی فتح تو کر لی مگر جب غزنی واپس پہنچا تو سلجوق قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ اور انھوں نے رے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ مسعود نے مقابلے کی ٹھانی مگر پے در پے ایسی شکستیں کھائیں کہ دو ہی سال بعد غزنی چھوڑ کر بچے کھچے لشکر اور باپ کے جمع کردہ خزانوں کیساتھ پنجاب کو روانہ ہوا، تاکہ از سر نو فوجیں مرتب کر کے سلجوقوں کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن ابھی وہ راولپنڈی کے نزدیک مارگلہ کی پہاڑیوں میں پہنچا تھا کہ اس کے ترکی اور ہندو غلاموں نے بغاوت کر کے سارا خزانہ لوٹ لیا۔ مسعود کو اس سرائے میں قید کر دیا جس میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ باغیوں نے اس کے اندھے بھائی محمد کو قید سے رہا کر کے سلطان بنا دیا اور پھر مسعود کو قید ہی میں مار دیا گیا۔

یہ خبر سنکر مسعود کا بیٹا مودود بلخ سے فوج لیکر بڑی برق رفتاری کیساتھ مارگلہ پہنچا۔ اس نے اپنے تایا (محمد، مسعود سے چند ثانیے بڑا تھا) محمد اور اسکے بیٹوں کو شکست دے کر قتل کر دیا اور سلطان بن بیٹھا۔

یہ سارے واقعات سنہ ۴۳۲ھ/۴۱-۱۰۴۰ء کے ہیں۔ مودود نے اس خوشی میں اسی جگہ ایک شہر بسایا جسے فتح آباد کا نام دیا اور اپنے باپ کی میت لے کر غزنی واپس

گیا۔ یہی فتح آباد آجکل راولپنڈی کہلاتا ہے۔ ادھر مودود کے بھائی مجدود نے ــــ جو ملتان کا والی تھا محمود کے محبوب امیر ایاز کی مدد سے لاہور پر قبضہ کر کے دریائے سندھ سے تھانیسر تک کے علاقہ پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ مودود اس کی سرکوبی کے لئے لشکر لے کر نکلا اور ۶ ذی الحجہ ۴۳۳ھ/۲۶ر جولائی ۱۰۴۲ء کو لاہور پہنچ گیا ابھی صفیں آراستہ بھی نہ ہوئی تھیں کہ عین عید الاضحیٰ کے روز مجدود اپنے خیمے میں مردہ پایا گیا۔ اس کے چند روز بعد امیر ایاز بھی انتقال کر گیا اور یوں ہندوستانی مقبوضات بھی مودود کے قبضہ میں آ گئے۔

اس سیاسی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر ۴۳۵ھ / ۱۰۴۳-۴۴ء میں ہندوؤں نے دہلی کے راجہ کی سرکردگی میں متحد ہو کر ہانسی، تھانیسر اور کانگڑہ پر یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا۔ مگر لاہوری امراء ٹس سے مس نہ ہوئے اور باہم دست و گریبان رہے۔ بالآخر جب ہندوؤں کے متحدہ لشکر نے لاہور کا بھی محاصرہ شروع کر دیا، تو وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئے اور ہندوؤں کے مقابلہ کے لئے میدان میں نکل آئے مگر ہندو لشکر مقابلہ کے بغیر پسپا ہو گیا اور یوں وہ علاقے جو ہندوؤں نے فتح کر لئے تھے انہی کے قبضہ میں رہے اور مسلمان بیاس تک کے علاقہ پر قانع ہو کر بیٹھ رہے۔

غزنی میں اکھاڑ پچھاڑ

مودود نے ۴۴۰ھ/۱۰۴۸ء میں اپنے دونوں بڑے بیٹوں ابوالقاسم محمود (یہ نام مشکوک ہے) اور منصور کو ایک ہی دن خلعت سے سرفراز کیا۔ محمود کو لاہور اور منصور کو پشاور میں متعین کیا۔ مودود اس کے اگلے سال ہی ۲۴ر رجب ۴۴۱ھ/ ۲۲ر دسمبر ۱۰۴۹ء کو پراسرار حالات میں انتقال کر گیا۔ امیر علی بن ربیع نے ساز باز کر کے مودود کے چار سالہ بیٹے مسعود ثانی کو تخت پر بیٹھا دیا لیکن امیر باستگین

نے صرف پانچ چھ دن بعد جوابی انقلاب برپا کرکے مسعود ثانی کو معزول کر کے اس کے چچا ابوالحسن علی بن مسعود اول کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد عبدالرزاق بن احمد بن حسن میمندی نے ابوالحسن کے چچا ابومنصور رشید الدین کو زنداں سے نکال تخت پر بٹھا دیا۔ ابوالحسن جیل بھیج دیا گیا۔ اس اثنا میں علی بن ربیع جس نے مودود کے چار سالہ بیٹے مسعود ثانی کو تخت پر بٹھانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا عملاً پنجاب کا حکمران بن بیٹھا تھا۔ رشید نے اسے حیلوں سے غزنی بلایا اور اس کی جگہ نوش تگین حاجب کو پنجاب کا گورنر بنا کر لاہور بھیجا جس نے کانگڑہ کو دوبارہ فتح کیا۔ ادھر ۴۴۴ھ/۱۰۵۳ء میں طغرل حاجب نے سلطان عبدالرشید کو اس کے خاندان کے نو افراد کے ساتھ قتل کر دیا اور خود سلطان بن بیٹھا۔ مگر نوشتگین نے خفیہ خطوط کے ذریعے غزنوی امرا کی حمیت کو جگایا اور انہیں طغرل کے خلاف اقدام پر آمادہ کیا چنانچہ ایک دن طغرل کو سر دربار قتل کر دیا گیا۔

نوشتگین نے غزنی پہنچ کر دوسرے امرا کے مشورے سے آل سبکتگین کی حکومت بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ بچے کھچے شہزادوں کی تلاش شروع ہوئی اور آخر بڑی دقتوں اور مشکلوں کے بعد تین شہزادوں کا سراغ ملا، فرخ زاد، ابراہیم اور شاہ شجاع۔ تینوں مختلف قلعوں میں قید تھے۔ امرا نے قرعہ اندازی کے ذریعے متفقہ طور پر ابوشجاع فرخ زاد بن مسعود اول کو تخت پر بٹھایا۔ فرخ زاد چھ سال تک حکومت کرنے کے بعد قولنج کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ اور ۴۵۱ھ/ ۱۰۵۹ء میں اس کا بھائی ابوالمظفر ابراہیم مصلّے سے اٹھ کر تخت پر بیٹھا اس نے عین عالم شباب میں دنیاوی لذتوں کو ترک کر دیا تھا۔ سال میں تین ماہ روزے رکھتا۔ ہر سال اپنے ہاتھ سے ایک قرآن شریف لکھ کر ہدایہ کے ساتھ مکہ معظمہ ارسال کرتا۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا شہر اجودھن اسی کے ہاتھ سے

فتح ہوا۔ اس نے روپڑ پر بھی اپنا پرچم لہرایا۔ سلطان ابراہیم تمام غزنوی بادشاہوں سے زیادہ عرصہ تک حکومت کرنے کے بعد ۴۹۲ھ/ ۱۰۹۹ء میں خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ بعض مؤرخوں نے اسے بادشاہوں کے بجائے درویشوں میں محسوب کیا ہے۔ اور اسے "سید السلاطین" کا لقب دیا ہے۔[۳۶]

ہمارے داتا صاحب اسی سلطان کے عہد حکومت میں لاہور تشریف لائے۔ داتا صاحب کا روضہ بھی اسی درویش صفت بادشاہ نے بنوایا۔

لاہور کا سیاسی انتظام

موجودہ لاہور داتا صاحب کے عہد سے پہلے کس قدر گمنام تھا اس کا ذکر ہو چکا۔ اس کی ناموری کا آغاز داتا صاحب کے زمانے سے ہوتا ہے۔ شروع میں ہندوستان کی تسخیر محمود غزنوی کا مطمع نظر نہ تھی تاہم دوآب کی مہموں کے دوران وہ اپنے مستقل مستقر سے بہت دور نکل آیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر بندھیل کھنڈ جیسے دور دراز مقامات تک ترکتازیاں دکھانی ہیں تو پنجاب کو مکمل کنٹرول میں لا کر وہاں سول اور فوجی انتظامیہ قائم کرنی ہوگی۔ اس نے موجودہ لاہور کو نئے صوبے کا صدر مقام بنانے کا فیصلہ کیا۔ ۲۲-۱۰۲۱ء (۴۱۲ھ) میں بڑی تعداد میں بڑھئی، لوہار سنگتراش اور معمار فوج کے ساتھ لئے اور لاہور کو روانہ ہوا۔ راستے کو ایسے عناصر سے پاک کرتا گیا جو امن وامان کے لئے خطرناک ہو سکتے تھے۔ لاہور پہنچ کر مختلف علاقوں میں حاکم مقرر کئے اور چھاؤنیاں قائم کیں۔[۳۷] غالباً یہیں سے لاہور کی بنیاد ڈالنے کی روایت محمود سے وابستہ ہوئی اور بعض مورخوں نے اس میں ایاز کو بھی شامل کر لیا۔[۳۸] لیکن اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ محمود نے موجودہ لاہور کی جگہ پر آباد سابقہ قلعہ مندگکور میں یا اس سے قدرے ہٹ کر ایک قلعہ اور سول سیکرٹریٹ

تعمیر کیا۔ غالباً اسی کا نام محمود پور تجویز ہوا[۳۹]۔ یہ تعمیرات جلد ہی مکمل ہو گئی ہوں گی کیونکہ لاہور کے عجائب گھر میں محمود پور کا ایک سکہ موجود ہے جو ۴۱۹ھ/ ۱۰۲۸ء میں مضروب ہوا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ محمود پور کا نام مقبول نہ ہو سکا اور صرف ربع صدی کے اندر سکوں پر لوہور مضروب ہونے لگا[۴۰]۔

سلطان محمود غزنوی نے لاہور کا سالار یا صوبیدار کسے مقرر کیا تھا؟ اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ سب سے پہلے جو شخص اس عہدے پر متمکن دکھائی دیتا ہے وہ عبداللہ قراتگین تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایرانی افسر علی ابوالحسن شیرازی کی پنجاب کے قاضی کے طور پر تقرری کا سراغ ملتا ہے۔ اختیارات دونوں کے برابر تھے کیونکہ جب قراتگین کو محمود غزنوی کی زندگی میں ہی واپس بلالیا گیا تو وزیر خواجہ احمد حسن میمندی نے جو قاضی شیرازی کو اپنا حریف سمجھتا تھا، طعنہ دیا کہ جرنیل قراتگین قاضی سے دب گیا تھا[۴۱]۔

۴۲۰ھ/۱۰۲۹ء میں یا اس سے کچھ پہلے عبداللہ قراتگین کی جگہ حاجب اریارُق صوبیدار یا سالار مقرر ہو کر لاہور آیا۔ قاضی علی شیرازی کی اریارق سے نہ بن سکی۔ اسی اثناء میں وزیر خواجہ معزول ہو چکا تھا۔ وہ کالنجر کے قلعہ میں اور اس کا بیٹا عبدالرزاق قلعہ نندونہ میں قید تھے۔ اریارق نے آتے ہی سراغرسانی کے محکمہ کے افسر اعلیٰ ..... (صاحب برید) کو ڈرایا دھمکایا کہ اس کے خلاف کوئی خبر سلطان کو بھیجی تو سر قلم کر دوں گا ___ اسی طرح عمال پر سخت رعب جمایا۔ معمولی نافرمانی پر سخت سزائیں دینا بلکہ واقعی بے گناہوں کو مروا ڈالنا۔ قاضی علی کی مسلسل تحریک پر ابوالفتح دامغانی اور ابوالفرج کرمانی عامل اور مشرف (شاہی محاسب) مقرر ہو کر لاہور آئے ___ مگر وہ بھی اریارق کو قابو میں نہ لا سکے۔

محمود نے اریارق کے ظلم و تعدی اور زبردستانی کے قصے سنے تو اُسے غزنی

175-176

طلب کیا مگر وہ نہ مانا جس پر مطعون اور مردود ہوا۔ اسی اثنا میں (۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) محمود انتقال کر گیا۔ اس کے جانشین محمد نے بھی اسے غزنی بلایا مگر وہ پھر ٹال گیا۔ محمد کی مختصر حکومت ختم ہونے پر مسعود تخت نشین ہوا، تو خواجہ احمد میمندی کو کالنجر کے قلعہ سے رہا کر کے غزنی طلب کیا۔ وہ لاہور سے گزرتے ہوئے اریارق کو سمجھا بجھا کر اور اپنی شفاعت کا یقین دلا کر ساتھ لیتے گئے۔ چند دن بعد جب وہ نشے میں دھت تھا تو طوق و سلاسل پہنا کر قید میں ڈال دیا گیا۔ وہ قید میں ہی مر گیا۔[۴۲]

اریارق کی جگہ ولایت لاہور کے "بڑے اور با نام" عہدے پر محمود غزنوی کے ایک معتمد اور خازن احمد نیال تگین (یا احمد اناتگین) کی تقرری عمل میں آئی۔ یہ واقعہ ۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء کا ہے۔ قاضی علی اپنے عہدے پر برقرار رہے۔ تاہم دونوں کی نگرانی کے لئے ابوالقاسم ابوالحکم کو صاحبِ برید مقرر کیا۔ محمود نے پنجاب میں دوعملی کی جو پالیسی وضع کی تھی اُسے بحال رکھا گیا۔ احمد نیال تگین کو ہدایت کی گئی کہ مال گزاری اور حساب کتاب میں دخل نہ دے۔ خواجہ احمد جو دوبارہ وزیر بن چکا تھا قاضی علی سے خار کھاتا تھا۔ اس نے نیال تگین کو قاضی کے خلاف بھڑکایا اور کہا اس شیرازی سے بچنا۔ وہ سالاروں سے اپنی فرمانبرداری کی توقع رکھتا ہے۔[۴۳] دوسری طرف قاضی کو بھی مطلع کر دیا گیا کہ تمہارا کام مالیات کی نگرانی ہے۔ فوج اور فوجی کمان سے تمہارا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ نیا سالار احمد نیال تگین اپنے فرائض اپنی صوابدید کے مطابق انجام دے گا۔ مواضعات کا خراج وصول کرے گا۔ اور جہاد کرے گا۔[۴۴] اس دوعملی اور خواجہ احمد میمندی کی طرف داری کا یہ نتیجہ نِکلا کہ لاہور آتے ہی دونوں میں ٹھن گئی۔ احمد نیال تگین نے اپنے فرائض کس خوبی سے انجام دیئے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نیال تگین نے لاہور میں رہ کر اپنے محدود وسائل کو اس خوبی سے منظم کیا کہ ۴۲۴ھ/۱۰۳۳ء میں لاہور سے

آٹھ سو میل دور بنارس پر اپنا جھنڈا لہرا آیا۔ بنارس سے جو مال و دولت حاصل ہوئی وہ غزنی پہنچائی۔ مگر قاضی علی شیرازی نے خفیہ اطلاع بھیجی کہ نیال تگین نے خراج و غنائم کا بہت بڑا حصہ غائب کر دیا ہے اور سلطان کو جزو قلیل پر ٹرخا دیا ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق اس پر یہ اضافہ بھی کیا کہ " اس کے ارادوں کا حال تو کسی کو معلوم نہیں تاہم وہ خود کو پسر محمود کہتا پھرتا ہے " نیال تگین پہلے بھی قاضی شیرازی سے خوش نہ تھا مگر تمام دیوانی حکام قاضی کے ساتھ تھے لہذا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ بنارس سے فتحیاب واپسی سے اس کے حوصلے اتنے بڑھے کہ ۴۲۵ھ / ۱۰۳۴ء میں قاضی علی اور اس کے ساتھیوں پر چڑھ دوڑا۔ وہ تلوار سے مقابلہ نہ کر سکتے تھے لہذا قلعہ مندکور میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ گویا احمد نیال تگین کی طرف سے اعلان آزادی تھا۔

ہندو حجام کی سرفرازی

دربار غزنی میں صلاح مشورے شروع ہوئے۔ کوئی امیر نیال تگین کے مقابلے پر جانے کو تیار نہ ہوا۔ سب سے بڑا عذر گرمی اور ساون کا تھا۔ مسلمان افسروں کی لیت و لعل سے طیش کھا کر ایک ہندو سردار تلک حجام خم ٹھونک کر میدان میں آیا۔ سلطان مسعود نے اسے سلطانی طبل و علم دے کر اس شان و شوکت کے ساتھ غزنی سے لاہور روانہ کیا کہ مسلمان امراء رشک سے ہونٹ کاٹتے تھے۔ تلک حجام کے لشکر نے لاہوری باغیوں پر اتنا اثر ڈالا کہ بہت سے سردار نیال تگین سے منحرف ہو گئے۔ شکست مقدر دیکھ کر بنارس کا فاتح احمد نیال تگین لاہور کے ایک حجام تلک سے لڑے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ تلک نے قاضی علی اور ان کے ساتھیوں کو محاصرہ سے چھڑایا اور باغی سردار کا سر لانے والے کو پانچ لاکھ درہم انعام دینے کا اعلان کیا۔ نیال تگین کسی دریا کو عبور کرتا ہوا مارا گیا۔ اس کا کٹا ہوا سر اور اسیر بیٹا تلک کے پاس لایا گیا۔ تلک یہ تحفے لے کر سلطان مسعود کے پاس حاضر ہوا۔ " کسوٹیٔ گراں بہا سے حجام سپہ سالار کا سر افتخار سے بلند کیا اور سلطان نے جواہر

کا طوق سر دربار اپنے ہاتھ سے اس کے گلے میں ڈالا۔ وہ مستقلاً سالار ہندوواں کے منصب پر فائز ہوا۔[۲۵]

امیر ایاز کی آمد

سلطان مسعود دو سال تک لاہور میں نیال تگین کے جانشین کا فیصلہ نہ کر سکا۔ اس عرصہ میں غالباً قاضی علی شیرازی بلا شرکت غیرے ولایت لاہور پہ حکمرانی کرتے رہے۔ ربیع الآخر ۴۲۷ھ/ ۱۰۳۶ء میں اٹھارہ بیس سالہ شہزادے مجدود بن مسعود کو لاہور کی امارت تفویض کی گئی۔ تین حاجب جو خود صاحب لشکر تھے اس کے ساتھ بھیجے گئے۔ ان میں اس کے دادا محمود کا محبوب امیر ایاز بھی شامل تھا جسے مجدود کا اتابیق بھی مقرر کیا گیا تھا۔ ابوالقاسم علی نوکی کے فرزند ابو منصور کو بطور دبیر۔ سعد سلیمان (جس کے بیٹے مسعود نے بطور شاعر بڑی شہرت حاصل کی) کو بطور مستوفی (وزیر مالیات) لاہور بھیجا گیا۔

سلجوقیوں کا عروج

۴۲۹ھ/ ۳۸-۱۰۳۷ء میں سلطان مسعود نے ہندوستان کا اچھوتا قلعہ فتح کرنے کی منت پوری کرنے کے لئے ہانسی اور سون پت پر حملہ کیا۔ وہ لاہور نہیں آیا تھا بلکہ ملتان سے چڑھائی کی تھی۔[۲۶] مسعود نے یہ مہم اپنے وزیر کے مشورے کے خلاف سر کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ مسعود اپنی پوری قوت سے سلجوقیوں کا مقابلہ کرے جو غزنی کے لئے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔ مسعود واپس پہنچا تو سلجوقی طلیقان اور فریاب پر قبضہ کرنے کے بعد مرو کو محاصرہ میں لے چکے تھے۔ امیر خراسان کو مقابلے کا حکم دیا تو اس نے اپنی بے مائیگی کا عذر پیش کیا۔ مجبور کرنے پر میدان میں گیا۔ مگر بری طرح شکست کھائی اور یوں سارا خراسان سلجوقیوں کے زیر نگین آ گیا۔ اس سے اگلے سال سلطان

مسعود نے سرخس کے معرکہ میں سلجوقوں پر فتح حاصل کی مگر ان کی قوت کو ختم نہ کر سکا مگر پھر ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء میں سلجوقوں سے شکست کھا کر ایسا بدحواس ہوا کہ میدان سے جان بچا کر نکلا اور غزنی پہنچ کر دم لیا۔ اپنے بیٹے مودود کو فوج دے کر بلخ بھیجا۔ مجدود کو جو لاہور کا امیر تھا ملتان میں متعین کیا۔ غزنی کا انتظام شہزادہ ایزدیار کے سپرد کر کے خود حرم اور اپنے والد کے ہندوستان سے حاصل کئے ہوئے خزانے تین سو اونٹوں پر لاد کر لاہور کو روانہ ہوا۔ وزیر خواجہ محمد بن عبدالصمد روکتا رہ گیا مگر مسعود سلجوقوں سے ایسا خوفزدہ ہوا تھا کہ کسی کی نہ مانی۔ مارگلہ کی پہاڑیوں میں پہنچا تو ترک اور ہندو غلاموں نے بغاوت کر کے سارا خزانہ لوٹ لیا اور مسعود کو قید کر کے گری کے قلعے میں ڈال دیا — معزول بادشاہ محمد کو تخت پر بٹھا دیا گیا[۴۶]

راولپنڈی کی بُنیاد

جس وقت راولپنڈی میں یہ خونیں ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا مجدود ملتان میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ جیسے اسے کچھ خبر ہی نہیں۔ اس کے بھائی مودود نے بلخ میں یہ خبر سُنی تو غزنی کو بھاگا اور ایک لشکر لیکر بڑی تیز رفتاری کے ساتھ راولپنڈی کی طرف بڑھا جہاں چچا محمد کے لشکر سے مقابلہ ہوا۔ مودود کو فتح حاصل ہوئی۔ اس نے چچا اور اس کے بیٹے کو اسی جگہ (۴۳۲ھ / ۱۰۴۱ء) قتل کیا اور فتح آباد (راولپنڈی) کی بنیاد رکھی۔ اور غالباً اپنے بھائی پر اعتماد کرتے ہوئے واپس غزنی چلا گیا۔ جہاں تاجپوشی کی رسم ادا ہوئی[۴۷]

مجدُود کا خاتمہ

اس اثنا میں مجدود نے یقیناً امیر ایاز کے مشورہ پر عمل کر کے ہندوستان میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دریائے سندھ سے لیکر

ہانسی اور تھانیسر تک اپنی حکومت قائم کرلی۔ مودود نے اس سے اطاعت کا مطالبہ کیا جسے اس نے نامنظور کردیا۔ ۴۳۳ھ/ ۱۰۴۲ء میں مودود نے لاہور کا رخ کیا۔ مجدود ان دنوں ہانسی میں بیٹھ کر دہلی پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا تھا۔ مودود کے ارادہ کی اطلاع پاکر مجدود لاہور پہنچا اور مقابلہ کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ دونوں بھائیوں کے لشکر آمنے سامنے تھے۔ خونریز جنگ ہونے کو تھی کہ عین عید الاضحیٰ ۴۳۳ھ/ ۷ جولائی ۱۰۴۲ء کو مجدود اپنے خیمے میں مردہ پایا گیا۔ امیر ایاز معزول ہوا، اور پندرہ سولہ سال گمنامی میں بسر کرنے کے بعد ۴۴۹ھ/ ۱۰۵۷ء میں انتقال کر گیا۔ رنگ محل لاہور میں اسی امیر ایاز کا مزار بتایا جاتا ہے۔[۴۸]

لاہور پر ہندوؤں کا حملہ

مودود نے لاہور پر قبضہ کرکے حکومت کس کے سپرد کی؟ فوجی انتظامات کس کے حوالے کیے؟ اس ضمن میں تاریخ بالکل خاموش ہے۔ اگلے سات برسوں میں لاہور غالباً بے ملک رہ گیا تھا۔ مختلف علاقوں میں کوئی نہ کوئی انتظام ضرور رہو گا۔ مگر اس میں کوئی مرکزیت نہ تھی۔ ہندوؤں نے اس سیاسی اور فوجی خلا سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دہلی کے راجہ کی قیادت میں انہوں نے یکے بعد دیگرے ہانسی۔ تھانیسر اور پٹھانکوٹ کے قلعے غزنویوں سے چھین لیے یہاں تک کہ ۴۳۵ھ/ ۱۰۴۴ء کے لگ بھگ ہندو لشکر لاہور کے نواح پر بھی حملے کرنے لگے۔ اس وقت امرائے لاہور باہم دست و گریباں تھے۔ بالآخر جب لاہور بھی ہاتھ سے جاتا دکھائی دیا تو خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ مودود کی اطاعت کا حلف اٹھایا اور متحد ہو کر ہندوؤں کے مقابلے کو نکلے۔ ہندو اب تک ان کے نفاق سے فائدہ اٹھا رہے تھے مگر اب انھیں متحد دیکھ کر محاصرے کا خیال چھوڑ کر پسپا ہو گئے

آخر کار کہیں ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء میں مودود کو لاہور کی بے نظمی کا خیال آیا اور اس نے اپنے ایک بیٹے منصور کو پشاور کا اور دوسرے کو لاہور کا امیر مقرر کیا۔ فرشتہ نے اس کا نام ابوالقاسم محمود لکھا ہے۔ لیکن مولانا ہاشمی کو اس سے اختلاف ہے۔ کہتے ہیں

کہ مودود نے اپنے جس بیٹے کو لاہور کا امیر مقرر کیا، اس کا نام کچھ اور ہوگا ــــ کیونکہ ابو القاسم محمود نامی جو شہزادہ بعد ازاں امیر لاہور مقرر رہا وہ سلطان ابراہیم کا بیٹا تھا۔ ابھی نیا انتظام مستحکم نہ ہو سکا تھا کہ اگلے سال ۴۴۱ھ/۹-۱۰۴۹ء میں سلطان مودود کا انتقال ہو گیا اور خود غزنی میں وہ افراتفری مچی کہ تخت کے پائے ہل گئے۔ دس برس کے عرصہ میں چھ بادشاہوں کا عزل و نصب ظہور میں آیا۔[۴۹]

علی بن ربیع کی بغاوت

مودود کے بعد پنجاب کا کیا بنا؟ اس کا کوئی واضح جواب نہیں ملتا۔ بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ غزنی کے ایک امیر علی بن ربیع نے مودود کے چار سالہ بیٹے ابو جعفر مسعود (ثانی) کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور اس کے پردے میں خود حکومت کرنے لگا۔ دوسرے امرا خصوصاً باستگین کو یہ جانشینی پسند نہ آئی اور انہوں نے متفق ہو کر مسعود ثانی کو چند دنوں کی حکمرانی کے بعد معزول کر دیا اور ابو الحسن بن مسعود اول کو تخت پر بٹھا دیا مگر اسی سال ۴۴۱ھ/۹-۱۰۴۹ء میں اسے عبد الرشید نے تخت سے محروم کر دیا۔ ابو الحسن نے فقیری اختیار کر لی۔ علی بن ربیع اپنے مہرے (مسعود ثانی) کے ہٹ جانے کے بعد، جس قدر زر و جواہر سمیٹ سکا سمیٹ کر پشاور بھاگ گیا۔ وہاں مودود کا بیٹا منصور متعین تھا۔ پتہ نہیں اس کا کیا بنا، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ علی بن ربیع نے ملتان اور سندھ کے علاقے پر قبضہ جما لیا۔ سلطان عبد الرشید نے حیلوں بہانوں سے علی بن ربیع کو واپس غزنی بلایا اور ہندوستان میں نظم و نسق بحال کرنے کے لئے حاجب نوشتگین کو ۴۴۳ھ/۱۰۵۱ء میں ولایت لاہور کا والی مقرر کیا اور اپنے برادر نسبتی طغرل حاجب کو سندھ اور مکران کی طرف بھیجا۔[۵۰]

غزنی میں ایک اور انقلاب!

لاہور کے نئے حاکم نوشتگین کے متعلق ہماری معلومات کا سارا ذخیرہ بس اتنا سا ہے کہ اس نے پنجاب میں امن و امان بحال کیا۔ نظم و نسق کی اصلاح کی اور پھر طوفانی

حملہ کر کے کانگڑہ کو ہندوؤں سے چھین لیا۔ اس کے علاوہ شمالی سرحد کو ہندوؤں سے پاک کیا۔ نوش تگین ابھی پنجاب میں مستحکم حکومت قائم نہیں کر سکا تھا کہ طغرل نے اپنی مہم سے واپس آ کر ۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء میں اپنے برادرِ نسبتی سلطان عبدالرشید کو گھیر کر مار دیا اور اسکے ساتھ آل سبکتگین کے نو افراد کو بھی قتل کر دیا، جو تخت کی دعویداری کر سکتے تھے۔ یہ خبر سن کر نوش تگین پشاور پہنچا۔ طغرل نے اسے بھی پھانسنا چاہا، مگر منہ توڑ جواب پایا۔ نوش تگین نے دوسرے امیروں کو بھی غیرت دلائی تو انھوں نے متحدہ اقدام کر کے طغرل کو جسے کافرِ نعمت کا لقب دیا گیا ہے، قتل کر دیا۔

اسکے بعد نوشتگین غزنی پہنچا تو تمام امرا سے یہ بات منوالی کہ آل سبکتگین کی حکومت بحال کر دی جائے لیکن اب مصیبت یہ تھی کہ کوئی شہزادہ ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ آخر بڑی تلاش کے بعد تین شہزادوں کا سراغ ملا جو مختلف قلعوں میں قید تھے: فرخ زاد، ابراہیم اور شاہ شجاع ــــ ان میں سے فرخ زاد کو بذریعہ قرعہ اندازی ۴۴۴ھ/۱۰۵۲ء میں سلطان مقرر کیا۔ فرخ زاد کے سات سالہ دورِ اقتدار میں لاہور کا نظم و نسق کس کے سپرد تھا یا اس اثنا میں لاہور پہ کیا بیتی؟ اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے ــــ تاہم مولانا ہاشمی نے بعض قرائن سے اندازہ لگایا ہے کہ اس عرصہ میں ابوبکر صالح جو بعد ازاں فرخ زاد کا وزیر بنا، لاہور کا والی تھا۔ اسی زمانے میں یا فرخ زاد کے جانشین، سلطان ابراہیم کے اوائل عہد میں نجم الدین شیبانی کو لاہور کا والی مقرر کیا گیا تھا۔[51]

لاہور کا نیا حاکم

۴۵۰ھ/۱۰۵۹ء میں سید السلاطین ابوالمظفر رضی الدین ابراہیم بن مسعود تخت نشین ہوا۔ اس کے فضائل پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے ــــ سیف الدولہ ابوالقاسم محمود کو غالباً ۴۶۶ھ/۱۰۷۳ء میں لاہور کا والی مقرر کیا، لاہور کی قدیم و جدید تواریخ میں اس شہزادے کی ولایت لاہور کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ مولانا ہاشمی نے پہلی مرتبہ بڑی عرق ریزی سے مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج مسعود رونی

کے قصائد سے اس کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔

ابوالقاسم کو دربار غزنی سے سیف الدولہ کا خطاب ملا اور پھر ہندوستان کی امارت پر فائز ہونے کے وقت خلیفۂ بغداد نے "صنیع امیر المومنین" کے خطاب کا اضافہ کیا۔ شہزادہ محمود کے مرتبے کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے ۔۔۔ کہ ہندوستان میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، اسے سر پر تاج رکھنے کی اجازت تھی اور اسے قریب قریب شاہی القاب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ شہزادہ محمود نے پنجاب میں نظم و نسق اور صنعت و تجارت کی بحالی پر توجہ مبذول کی اور جلد ہی لاہور کی پرانی عظمت ہی بحال نہ کر دی بلکہ اس میں مزید اضافہ کیا۔

لاہور کی امارت کے دوران اس کا سب سے بڑا کارنامہ آگرہ کی فتح ہے۔ اس نے یہ حملہ روپیہ پیسہ حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض جہاد کا ثواب حاصل کرنے کے لئے کیا تھا۔ آگرہ کی مہم کے لئے اس نے چالیس ہزار سواروں کا لشکر لاہور سے ہی انتخاب کیا تھا۔ جس شہر سے چالیس ہزار سوار چھانٹ کر علیحدہ کئے جا سکے اس کی مجموعی آبادی یقیناً لاکھوں میں ہوگی۔ اس کے عہد میں لاہور تعمیرات اور ثقافت میں غزنی کا ہم پلہ بن گیا۔

کسی بدخواہ نے سلطان ابراہیم کے کان بھرے کہ اس کا بیٹا شہزادہ محمود اس کے دشمن ملک شاہ سلجوقی کے پاس عراق جانے کی سوچ رہا ہے۔ سلطان ابراہیم نے ۴۸۰ھ / ۱۰۸۷ء میں اسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا۔ اس کی جگہ ایک اور بیٹے علاء الدولہ مسعود کو پنجاب کا والی مقرر کیا۔ یہی مسعود بعد ازاں مسعود ثالث کے نام سے غزنی کا تاجدار بنا ۔۔۔ حلم و تحمل اور فیاضی کے پیش نظر اسے مسعود الکریم کا لقب دیا گیا۔

اس کے زمانۂ امارت ہند کے متعلق بس اتنا ہی معلوم ہے کہ اس نے ہندوستان میں جہاد کا سلسلہ جاری رکھا[۵۲]۔ اس کی امارت کا زمانہ ۴۸۰ھ / ۱۰۸۷ء اور ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء کے درمیان تخمین کیا گیا ہے[۵۲]۔ اس کے ساتھ ہی داتا صاحب رح کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے، ورنہ اس کے جانشین بھائی شیرزاد نے ۴۹۳ھ / ۱۱۰۰ء میں ہندوستان

کا والی مقرر ہونے کے بعد لاہور کو جو ترقی دی وہ بے مثال تھی

مرکز ثقافت

داتا صاحبؒ کے عہد کا لاہور شمشیر زنی کا ہی مرکز نہ تھا، بلکہ بقول عوفی: "ایک خطہ بفضل لامتناہی او برسائر بلاد و مفاخر و مباہی" — بھی تھا۔ ساتویں صدی ہجری کے اس تذکرہ نگار نے مسلم لاہور کے جس پہلے شاعر کا ذکر کیا ہے وہ سلطان مسعود اول — (۴۲۱ تا ۴۳۲ھ / ۱۰۳۰ تا ۱۰۴۱ء) کے زمانہ کا شاعر ابو عبداللہ روز بہ ابن عبداللہ النکتی اللہوری ہے، ایرانی الاصل تھا۔ اس کا باپ الحاقِ پنجاب کے بعد ہی لاہور میں آگیا تھا۔ اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں!

لاہور کا پہلا نامی شاعر ابو الفرج بن مسعود الرونی ہے۔ جو مولانا ہاشمی کی تحقیق کے مطابق الحاق لاہور سے چند سال بعد ۴۲۶ھ / ۱۰۳۵ء میں لاہور کے ایک گاؤں رونہ میں پیدا ہوا جسکا اب نشان تو کیا — نام بھی نہیں ملتا۔ الوری نے اسی کا ایک شعر چرا کر بدنامی مول لی تھی — رونی کسی ذی وجاہت خاندان کا فرد نہ تھا۔

مسعود سعد سلمان کو لاہور کے شاعروں میں ممتاز مقام حاصل ہے، اسکے والد سعد سلمان شہزادہ مجدود کے ساتھ مستوفی بنا کر لاہور بھیجے گئے — اصلاً ہمدان کے رہنے والے تھے، لاہور میں انہیں جاگیر ملی تھی اور وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے تھے۔ مسعود کی پیدائش لاہور میں ہوئی — اسے لاہور سے جو محبت تھی اسکا اظہار کئی قصائد اور قطعات میں کیا ہے۔ ۴۹۲ھ / ۹۸-۹۹-۱۰ء میں یا کچھ بعد انتقال کیا۔ بعض روایات کے مطابق وہ غزنی میں مدفون ہوا، مگر اس کی کوئی سند نہیں! مزنگ لاہور میں اس کی قبر دکھائی جاتی ہے اور اگر یہ درست ہے تو پھر اسے عہد غزنوی کی دو اثری نشانیوں مزار داتا گنج بخش اور مزار امیر ایاز کے ساتھ ایک اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

اسکی عمر کا کافی حصہ جیل خانوں میں گزرا، قید میں اس نے جو شاعری کی — وہ بے مثال ہے۔ اسی لئے وہ حبسیہ شاعری کا امام کہلاتا ہے۔ مسعود فارسی کے ساتھ عربی میں

بھی شعر کہتا تھا۔ مسلم لاہور کا یہ پہلا شاعر ہے جو پنجابی میں بھی شعر کہتا تھا بلکہ پنجابی کا صاحب دیوان شاعر تھا۔

مولانا ہاشمی مرحوم نے مسعود سعد سلمان کی ایک مثنوی کے ذریعے داتا صاحب کے عہد کے فوراً بعد کے امرائے دولت سے روشناس کرایا ہے۔ داتا صاحب کے زمانہ میں بھی امرائے لاہور کی معاشرت کچھ مختلف نہ ہوگی۔ خواجہ ابونصر فارسی کو نشہ چڑھتا ہے ـــ تو شاہنامے کے سینکڑوں شعر پڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر چلتے چلتے ایک پیالے پر اور ہاتھ مارتا اور امیر لاہور کو دعائیں دیتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے۔ امیر بہمن نیک نام خاندانی امیر ہے۔ آداب تہذیب سے خوب واقف ہے۔ لطافت میں کوئی مدمقابل نہیں۔ سید ابوالفضائل۔ جگر شیر کا اور بدن ہاتھی کا۔ اسکے دم قدم سے مجلس کی رونق ہے ـــ شہزادہ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اسے مست کرنے کے لئے چھ قدحے درکار ہیں۔ حسین طبیب اپنے فن کا ماہر ہے۔ جالینوس کی غلطیاں نکالتا ہے۔ نرد کھیلنے کا شائق ہے!

اسی مثنوی میں مسعود سعد سلمان نے دربار لاہور سے وابستہ بعض ارباب طرب سے بھی تعارف کرایا ہے، مثلاً محمد نے نواز بانسری بجانے میں کمال رکھتا ہے..... عثمان نامی گویے کے ذکر سے اس وقت کے لاہور میں قحبہ خانوں کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسفندیار چنگ بجانے میں جواب نہیں رکھتا ـــ ہمیشہ خلعت و نقد سے نوازا جاتا ہے مگر جوئے کا ایسا چسکا پڑا ہے کہ دربار سے نکلتے ہی خلعت شاہی کو بیچکر قمار خانے میں جا پہنچتا ہے اور اکثر وہاں سے صرف پاجامہ پہنے گھر جاتا ہے۔ ایک سرود نواز چھوکرا بڑی قدر رکھتا تھا، مگر امیر لاہور سے بھاگ کر قحبہ خانے میں جا چھپتا ہے۔ اسیطرح ایک مطربہ پری اور بانو قوال اور رقاص ماہو کا تعارف کرایا گیا ہے۔

مسعود سعد سلمان نے اپنی مثنوی "شہر آشوب" میں ہمیں لاہور کے جن پیشہ وروں سے متعارف کرایا ہے: ان میں قصاب، نان بائی، رنگریز، کسان، سقے، تاجر، زرگر، لوہار، منزی، معمار، تیرگر، باغبان، عطار، طبیب، منجم، فال گیر، ملاح تیراک، پہلوان، چوگان باز، کبوتر باز، پارچہ باف، عنبر فروش، جوہری اور علماء

ہیں قاضی ۔ فقیہہ ۔ مہندس ۔ فلسفی ۔ صوفی ۔ قلندر اور واعظ وغیرہ شامل ہیں۔[57]

یہی وہ لوگ ہوں گے جن میں داتا صاحب کے شب و روز بسر ہوتے ہوں گے، یقیناً اسی معاشرت کے باعث داتا صاحب نے کشف المحجوب' میں جگہ جگہ طبقہ امراء سے کراہت کا اظہار کیا ہے۔ غالباً یہی وہ لوگ تھے جن کی صحبت کو داتا صاحب نے ناجنسوں میں گرفتاری قرار دیا تھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ دنیادار بھی اس نظام سے خوش نہ تھے۔ مسعود سعد سلمان نے گلہ کیا کہ کسب حلال میں پوری نہیں پڑتی ـــ علم و ادب کی بے قدری کا گلہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے سعادت کو نصیحت کرتا ہے کہ آج کل علم و فضل کی ایسی مٹی پلید ہوئی ہے کہ تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ دے۔ اگر دنیا میں بھلائی چاہتے ہو تو جولاہے کا پیشہ اور عیب و جہالت کا راستہ اختیار کر"۔[58]

غزنی جو داتا صاحب کے زمانہ حیات سے تقریباً نصف صدی قبل' ایک شاندار اور بے حد متمول سلطنت کے طور پر دنیائے اسلام کے نقشے پر ابھرا تھا ـــ داتا صاحبؒ کی حیات کے تقریباً پچاس سال بعد ہی علاء الدین غوری "جہاں سوز" کے ہاتھوں اس طرح جلا کہ اسکا کچھ بھی نہ بچا۔

غزنوی خاندان کے آخری دو سلاطین یعنی ظہیر الدولہ خسرو شاہ (متوفی ۵۵۵ھ/ ۱۱۶۰ء) اور سراج الدولہ خسرو شاہ نے ۵۸۲ھ/ ۱۱۸۶ء میں شہاب الدین محمد بن سام کے ہاتھوں شکست کھانے تک اپنا مرکز اسی لاہور کو بنایا ـــ لیکن وہ لاہور جو داتا صاحب کے زمانہ میں عالم وجود یا عالم شہود میں آیا تھا ـــ اور جسے غزنویوں نے ترقی دے کر بغداد۔ بخارا و سمرقند کا ہمسر بنا دیا تھا ۔ وہ بھی داتا صاحب کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد (۶۳۹ھ/ دسمبر ۱۲۴۱ء) مغلوں کے سپہ سالار طائر کے لشکر کے ہاتھوں اس طرح برباد ہوا کہ نہ تو کوئی ذی نفس زندہ بچا، اور نہ کوئی عمارت محفوظ رہی۔ تیس سال بعد سلطان غیاث الدین بلبن نے اس ویرانے کو زر کثیر صرف کرکے دوبارہ آباد کیا۔[59]

باب ۵

داتا صاحب لاہور میں

****

"کشف المحجوب" سے پتہ چلتا ہے کہ داتا صاحب نے غزنی سے آکر لاہور میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے پہلے مفتوحہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا تھا، اور غالباً اسی دوران ہندو عقائد سے واقفیت حاصل کی ــــ مثلاً اولیاء پر انبیاء کی فضیلت کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرقہ حشویہ (اہلِ تجسیم جو خدا تعالےٰ کے جسم کے قائل ہیں) اور مشبہین (اللہ تعالےٰ کے عام لوگوں سے مشابہ جسم کے قائل) کے عقائد کو رد کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

یہ دونو گروہ جو اسلام کا دعوٰی کرتے ہیں انبیا کی تخصیص و فضیلت کی نفی کے بارے میں برہمنوں سے متفق ہیں اور جو شخص انبیاء کی تخصیص کی نفی کا اعتقاد رکھے وہ کافر ہوتا ہے[1]۔"

اسکے بعد روح کی حقیقت کے بیان میں رُوح کو قدیم جان کر اس کی پرستش کرنے اور ارواح کو قدیم و مدبر عالم ماننے اور روح کے ایک جسم سے دُوسرے جسم کی طرف پلٹ جانے کا نظریہ رکھنے والوں میں نصارٰے، شیعوں، قرامطیوں ــــ اور باطنیوں کے ساتھ ہندوؤں اور بدھوں کو بھی شامل کیا ہے[2]۔

یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ داتا صاحب نے بدھوں کا نام نہیں لیا، بلکہ اُنکا ذکر اہلِ تبت اور چین و ماچین والوں کے طور پر کیا ہے۔ پنجاب میں داتا صاحب کے پیشرو

البیرونی نے بھی بدھ مت سے اغماض برتا ہے۔ کتاب الہند کے مترجم ایڈورڈ سی زخاؤ نے بھی بدھ مت کو نظر انداز کر دینے پر تعجب کا اظہار کیا، اور اسکی وجہ یہ قیاس کی ہے کہ غالباً گیارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں وسطی ایشیا، خراسان، افغانستان، اور شمال مغربی ہندوستان سے بدھ مت کے تمام آثار مٹ چکے تھے[۳] — زخاؤ کے اس خیال کی تصدیق کشف المحجوب کی مذکورہ عبارت سے بھی ہوتی ہے جسکے مطابق بدھ مت تبت اور چین میں ہی رہ گیا تھا۔

محمود کی تلوار و صوفی کی محبّت

ہندوؤں کے عقائد کا بیان کشف المحجوب کے اصل موضوع سے خارج تھا۔ تاہم مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے عقائد و نظریات کے ضمن میں ہندو عقائد کا حوالہ دیئے جانے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ داتا صاحب ان سے بخوبی آگاہ تھے — یہ آگاہی ذاتی تحقیق کا نتیجہ تھی یا البیرونی کی کتاب الہند پر مبنی تھی؟ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے — تاہم موسیقی کے باب میں دیئے گئے ایک حوالہ سے اشارہ ملتا ہے کہ کتاب الھند داتا صاحب کی نظر سے گزر چکی تھی۔ ہندوستان میں جہاں کے علماء اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے — اسلام کی تبلیغ کے لئے ہندوؤں کے عقائد سے واقفیت حاصل کرنا ضروری امر تھا —

چونکہ داتا صاحب کے پیشِ نظر صرف تبلیغ تھی، لہذا محبت کے باب میں اشاعتِ دین کے لئے تلوار پر زبان کی فوقیت ظاہر کرتے ہوئے ایک بزرگ کا یہ مقولہ پیش کرتے ہیں کہ

"ہندوؤں میں محمود کی تلوار کا غلام بننے کی بہ نسبت محبت کا غلام بننے کی رغبت زیادہ پائی جاتی ہے۔"

داتا صاحب نے کشف المحجوب میں ہندوستان میں اپنی سیاحت کے تجربات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"میں نے ہندوستان میں دیکھا ہے کہ زہرِ قاتل میں ایک کیڑا پیدا ہو جاتا

ہے اور اس کی زندگی اس زہر پر ہی موقوف ہوتی ہے اس لئے کہ وہ ہمہ تن زہر ہی ہوتا ہے۔"

داتا صاحب نے سماع کے باب میں انسانوں اور جانوروں پر آواز خوش اور نغمہ ساز کے اثرات بیان کرتے ہوئے خراسان اور عراق کی طرح ہندوستان میں موسیقی کے ذریعے شکار کا طریقہ بتایا ہے، لکھتے ہیں :

"ہندوستان میں ایک جماعت ہے جو باہر جنگل میں جا کر سریلی آواز میں گاتی ہے۔ جب ہرن ان سریلی آوازوں کو سنتے ہیں تو ان کی طرف دوڑ آتے ہیں، لوگ ان کے گرد گھومتے اور گاتے بجاتے ہیں، یہاں تک کہ راگ کی لذت کے باعث ہرن آنکھیں بند کر کے سو جاتے ہیں اور پھر وہ شکاری ان کو پکڑ لیتے ہیں۔"

کشف المحجوب کی یہ عبارت البیرونی کی کتاب الہند کا ایک اقتباس لگتی ہے۔ البیرونی موسیقی کے ذریعے شکار کے ہندوستانی دعوے کی قلعی کھولتے ہوئے لکھتا ہے، کہ اس کی وجہ کوئی جادو ٹونا نہیں بلکہ میری رائے اور تحقیق کے مطابق یہ ہے کہ جانوروں کو مسلسل ایک ہی دھن سنا کر اس کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔ ہمارے لوگ تو موسیقی کے ذریعے IBEX کو شکار کر لیتے ہیں، جو ہرن سے کہیں زیادہ وحشی ہوتا ہے — داتا صاحب نے ہرنوں کے گرد گاتے بجاتے ہوئے چکر لگانے کا جو طریقہ ہندوستان سے منسوب کیا ہے اسے البیرونی نے 'اپنے لوگوں' کا قاعدہ بتایا ہے۔ عین ممکن ہے کہ داتا صاحب نے ہندوؤں کو محبت کا غلام بتاتے سے متعلق کسی بزرگ کا جو مقولہ عربی میں پیش کیا ہے وہ بھی البیرونی کا ہو۔

لاہور میں غازی

ایک پہلے باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ داتا صاحب کی لاہور میں تشریف آوری کے وقت مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد پنجاب کے مختلف حصوں میں آباد ہو چکی تھی ——

یہاں تک کہ حضرت اسمٰعیل بخاریؒ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء میں لاہور آئے تھے[8]۔ اس وقت لاہور پر جے پال کی حکومت تھی، جس نے شیخ اسمٰعیلؒ کی آمد سے سات سال پہلے لاہور کے بانی راجہ کے پوتے جیندرت کو شکست دی تھی[9]۔

لاہور پر محمود کا قبضہ شیخ اسمٰعیلؒ کی تشریف آوری کے پندرہ سولہ سال بعد ہوا شیخ اسمٰعیلؒ کی تبلیغ سے پہلے ہی جمعۃ المبارک کو ڈھائی سو، دوسرے جمعہ کے وعظ سے ساڑھے تین سو اور تیسرے جمعہ کو پانچ سو ہندو مسلمان ہوئے تھے[10]۔ ۴۴۸ھ/۱۰۵۶ء میں ان کی رحلت کے وقت تک لاہور میں نومسلموں کی تعداد جہاں تک پہنچ چکی ہوگی، اس کا ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ محمود کے ہاتھوں پنجاب کی فتح کے بعد لاہور میں افغانستان اور ایران سے آنے والے مسلمانوں کی آبادی بھی قابلِ لحاظ ہو گئی تھی ــــ اور یوں لاہور آجکل کی اصطلاح میں کاسموپولیٹن شہر بن گیا تھا ــــ

داتا صاحب کے زمانہ میں لاہور کی آبادی کے ایک حصہ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے ــــ مؤرخوں نے اسے "غازیوں" کا نام دیا ہے ــــ یہ وہ لوگ تھے جو عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں سے محض جہاد کا ثواب حاصل کرنے کے لئے محمود کے لشکر میں آن شامل ہوتے تھے۔ غازیوں کو مستقل لشکر کی طرح تنخواہ نہیں ملتی تھی، البتہ بعض اوقات اسلحہ مل جاتا تھا۔ یہ غازی صرف مالِ غنیمت پر گزر بسر کرتے تھے۔ ۳۹۱ھ/ ۱۰۰۱ء میں پشاور اور ویہند کی مہموں میں دس ہزار غازی شریک تھے۔ ۴۰۹ھ/ ۱۰۱۸ء میں قنوج کی مہم میں ماوراء النہر کے بیس ہزار غازی شامل تھے۔

سومنات کی مہم میں محمود نے غازیوں کو اسلحہ خریدنے کے لئے پچاس ہزار دینار اپنے خزانے سے دیئے تھے۔ مفتوحہ علاقوں کی حفاظت پر بھی غازی ہی مامور کئے جاتے تھے مسعود کے عہد میں "سالارِ غازیاں" کا ایک عہدہ قائم ہو گیا تھا[11] ــــ جس کا صدر مقام لاہور تھا اور ایک ترک غلام عبداللہ قراتگین "سالارِ غازیاں" کے عہدے پر فائز تھا ان غازیوں میں مختلف عقائد کے لوگ ہوتے ہوں گے ــــ اور اگر ان میں کچھ تعداد

صوفیوں کی ہو تو ہمیں چنداں متعجب نہ ہونا چاہیئے۔ اس گمان کا سبب کشف المحجوب ہی کی ایک عبارت ہے۔

داتا صاحبؒ نے سفر میں آداب صحبت پر روشنی ڈالتے ہوئے کسی صوفی کیطرف سے اقامت ترک کر کے سفر اختیار کرنے کی یہ شرط رکھی ہے کہ سفر نفس کی متابعت کے لئے نہ ہو۔ بلکہ محض اللہ کے لئے ہو، اللہ کے لئے سفر کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اسے حج، زیارت، علم یا غزوہ کے لئے اختیار کیا جائے ۔ بصورت دگر صوفی سفر میں خطا وار ہوگا۔[۱۲]

مختلف عقائد کے لوگ

پنجاب میں مختلف عقائد کے مسلمانوں کی موجودگی کا ثبوت کشف المحجوب کی ایک عبارت سے بھی ملتا ہے ۔ فنا و بقا کے باب میں فرقہ خرازیہ کے عقائد پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک گروہ نے فنا و بقا کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس گروہ کا خیال ہے کہ فنا یہ ہے کہ اپنی ذات کو خدا میں مدغم کر کے نیست و نابود ہو جائے اور بقا یہ ہے کہ حق تعالےٰ کی بقا بندہ میں شامل ہو جائے۔ داتا صاحب لکھتے ہیں کہ :

> "یہ دونوں باتیں محال ہیں۔ میں نے ہندوستان میں ایک آدمی کو دیکھا جو تفسیر و تذکیر اور علم کا مدعی تھا۔ اس نے اس موضوع پر مجھ سے مناظرہ کیا، اسکی باتوں پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص نہ تو فنا و بقا کو جانتا تھا اور نہ ہی قدیم اور محدث میں فرق کر سکتا تھا اور جاہلوں میں ایسے لوگ بہت ہیں"[۱۳]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور میں داتا صاحب کا مشن صرف ہندوؤں کو مسلمان بنانا ہی نہیں ۔ بلکہ اس سے زیادہ مہتم بالشان تھا یعنی مسلمانوں کے عقائد کی اصلاح ۔ داتا صاحب نے یہ دوہرا مشن جس کامیابی کے ساتھ پورا کیا، اسکی وضاحت ضروری ہے دارا شکوہ کے الفاظ میں :

"اس اطراف کے سبھی باشندے آپ کے مرید و معتقد ہو گئے۔
لاہور ایک سوٹھا اور متبرک شہر ہے لگا"

داتا صاحب نے لاہور میں جس طرح اپنا مشن انجام دیا، اسکی تفصیل کہیں بھی نہیں ملتی۔ تاہم کشف المحجوب کی داخلی شہادتوں سے جو مبہم سا خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے۔ اسکے پیش نظر بے اختیار ہو کر داتا صاحب سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے:

داتا صاحب کی تمنّا

داتا صاحب نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بلاد اسلامیہ کی سیاحت میں بسر کیا مگر کبھی ایک جگہ بھی سفر کی صعوبتوں کا گلہ نہیں کیا۔ ہاں البتہ جب اپنی سیاحتوں کے دوران کسی گدڑی پوش کو ہاتھ پھیلائے دیکھتے یا کبھی خود آپ کو کسی کے مجبور کرنے پر یہ کام کرنا پڑتا تو دل خون کے آنسو رونے لگتا۔ بے شک داتا صاحب نے مریدوں کی تربیت کے دوران فخر اور غرور کو دماغ سے نکالنے کے لئے "سوال" کی اجازت دی ہے۔ مگر اس پر کڑی پابندیاں کر دی ہیں مثلاً کسی جگہ سے دھتکارے جانے پر خوشی محسوس کرے۔ اور اپنے اور خدا کے درمیان کسی شخص کو حائل نہ سمجھے۔ عورتوں اور بازاری لوگوں سے سوال نہ کرے۔ صرف اسی شخص سے سوال کیا جائے جسکے مال کے حلال ہونے کا یقین واثق ہو، صرف وقت کی ضرورت کے مطابق سوال کیا جائے کل کی ضرورت کا خیال نہ کرے، تاکہ ہمیشہ کی تباہی میں گرفتار نہ ہو۔ اللہ تعالےٰ کو اپنی گدائی کا جال نہ بنائے[15]۔ لیکن جب داتا صاحب کسی جگہ یہ جال پھیلا ہوا دیکھتے تھے تو تڑپ جاتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"ایک دفعہ میں اپنے شیخ کے ہمراہ آذربائیجان میں جا رہا تھا کہ دو تین گدڑی پوشوں کو دیکھا۔ وہ گندم کے ایک ڈھیر پر اپنی گدڑیوں کے پلو پھیلائے کھڑے تھے۔ کسان نے ان میں کچھ غلّہ ڈال دیا۔ میرے شیخ نے ان کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑھی

— "یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید
لی، پس ان کی تجارت کچھ نفع مند نہ ہوئی اور در اصل
وہ ہدایت پانے والے نہ تھے" — میں نے پوچھا: "اے
شیخ! یہ لوگ کس وجہ سے اس بلا میں مبتلا ہیں اور مخلوق کے
سامنے رسوا ہوتے ہیں؟" — انھوں نے فرمایا: "ان کے
پیروں کو مرید جمع کرنے کی حرص تھی اور انھیں دنیا جمع کرنیکی۔
اور کوئی حرص بھی دوسری حرص سے بہتر نہیں ہوتی۔"[۱۶]

سوال سے اپنی کراہت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"مجھے اپنے سفروں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ناگوار،
اور رنج دہ نہیں تھی کہ جاہل خادم اور بے خوف مقیم مجھ کو
اپنے ساتھ لے لیتے اور کبھی اس خواجہ کے گھر اور کبھی اس
زمیندار کے گھر لئے پھرتے اور میں دلی کراہت سے ان کے
ساتھ چلتا اور بظاہر درگزر کرتا۔"

پھر اس ضمن میں اپنے ایک عہد کا اعلان کرتے ہیں :

"مقیم لوگ مجھ سے جو بے قاعدگیاں کیا کرتے تھے میں ان کی
وجہ سے دل میں عہد کر لیتا کہ اگر میں کسی وقت مقیم ہو جاؤں گا
تو مسافروں سے کبھی ایسا سلوک نہ کروں گا"[۱۷]

لاہور میں چشمۂ فیض

داتا صاحب نے بتایا ہے کہ مقیم وہ ہوتا ہے جس نے مطلوب حاصل کر لیا ہو۔ جب داتا
صاحب مطلوب کو پا لینے کے بعد لاہور میں اقامت گزین ہو گئے تو انھوں نے عوام اور
مسافروں سے حسن سلوک کا عہد کس طرح پورا کیا؟ اس کی ایک جھلک " اقامت میں صحبت

کے آداب" میں ملتی ہے، جہاں آپ مریدوں کو ہدایت کرتے ہیں :

"جب کوئی درویش سفر چھوڑ کر اقامت اختیار کرلے تو اس کے ادب کی شرط یہ ہے کہ جب کوئی مسافر اسکے پاس پہنچے تو اسکی عزت کرے، خندہ پیشانی سے پیش آئے اور کامل ادب و احترام سے اسے اپنا مہمان قبول کرے — تکلف کے بغیر جو کچھ موجود ہو حاضر کرے۔ یہ نہ پوچھے کہ کہاں سے آئے ہو یا کہاں جاؤ گے یا تمہارا نام کیا ہے۔ ان کے آنے کو خدا کی طرف سے، ان کے جانے کو خدا کی طرف سے اور ان کے نام کو خدا کا بندہ خیال کرے۔ پھر غور کرے کہ اس کو آرام کیلئے تنہائی چاہئے یا صحبت۔ اگر اس کو خلوت پسند ہے تو اسکے لئے جگہ خالی کردے۔ اگر اس کو صحبت پسند ہے تو بے تکلف محبت او ہمدردی سے گفتگو کرے اور جب مسافر سونے کیلئے لیٹ جائے تو مقیم کو چاہیئے کہ اس کے پاؤں دابے۔ دوسرے دن اسے کسی صاف ستھرے حمام میں لے جائے، وہاں اسے اجنبی خدمت گار کے حوالے نہ کرے بلکہ خود اس کی خدمت کرے اسکے بدن کو اپنے ہاتھوں سے ملے تاکہ وہ بدن کی صفائی کی طرح خود بھی تمام عیبوں سے پاک ہو جائے۔ مقدور ہو تو اسے نئے کپڑے بنوا دے ورنہ اس کے پرانے کپڑوں کو ہی دھو ڈالے — تاکہ حمام سے نکل کر اسے پہن لے — حمام سے واپسی پر اسے تین دن اور ٹھہرائے۔ اگر اس شہر میں کوئی بزرگ یا کوئی جماعت یا اسلام کے اماموں میں سے

کوئی موجود ہو تو اسے وہاں چلنے کی دعوت دے۔ اگر انکار ہو تو مجبور نہ کرے کیونکہ طالبانِ حق پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اپنا دل بھی ان کے قابو میں نہیں ہوتا۔ یہ تو کسی حالت میں بھی روا نہیں کہ مسافر کو اہلِ دنیا کو سلام کرنے یا دعوت یا عیادت کے لئے لے جائے۔ انھیں گدائی کا آلہ بنانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ سرے سے ان کی کوئی خدمت ہی نہ کی جائے[19]"۔

اس میں کیا شک ہے کہ داتا صاحب نے دوسروں کو جو نصیحت کی ہے خود اس پر کتنی چند عمل کرتے ہوں گے اور اسی حسن سلوک اور غریب پروری کی انتہائی دل کش عادات کے باعث "مخدوم" اور "گنج بخش" کہلانے لگے ہوں گے۔

"گنج بخش"

سیّد علی ھجویری رح پاکستان اور ہندوستان میں داتا صاحب یا گنج بخش کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں — اس لقب کے ضمن میں یہ روایت زبان زدِ خلائق ہے کہ جب خواجہ معین الدین چشتی رح ہندوستان میں تشریف لائے تو لاہور پہنچ کر، حضرت شیخ علی الہجویری کے مزار پر چلہ کاٹا جس کی تکمیل پر مزار کی پائنتی کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا

گنج بخش ہر دو عالم مظہر نورِ خدا

ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

اس روز سے لقب گنج بخش مشہور ہوا[20] — تحقیقاتِ چشتی کے بعد تذکرہ نویسوں نے پہلا مصرعہ بدل دیا۔ اب اسے یوں پڑھا جاتا ہے:

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا

اس وقت مزار پر جو لوح نصب ہے اس پر بھی پہلا مصرعہ اسی طرح لکھا ہے —

مولانا ہاشمی مرحوم لکھتے ہیں کہ :

"ادبی اعتبار سے یہ شعر اتنا ادنیٰ، بلکہ نادرست نظر آتا ہے کہ ہم خواجہ بزرگ رح سے اسے منسوب کرنا ادب کے خلاف خیال کرتے ہیں [۲۱]"

داتا صاحب سے منسوب ایک رسالہ "کشف الاسرار" میں داتا صاحب کو اس لقب پر تاسف کا اظہار کرتے دکھایا گیا ہے :

"اے علی! خلقت تجھے گنج بخش کہتی ہے حالانکہ تیرے پاس ایک دانہ تک نہیں تو اس بات پر فخر نہ کر کیونکہ یہ غرور ہے گنج بخش اور رنج بخش صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو بے مثل ہے جس کی مانند کوئی دوسرا نہیں۔ جو شبہ سے پاک ہے اور نمونے سے آزاد ہے ــــ جب تک تو زندہ ہے شرک کے قریب نہ جا اور اللہ تعالیٰ کو واحد اور لاشریک خیال کر [۲۲]"

اگر یہ رسالہ واقعی داتا صاحب کا لکھا ہوا ہے تو آپ اس لقب کو شرک سمجھتے تھے۔ اس شہادت سے قطع نظر قرائن سے یہی پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنی زندگی میں ہی اس لقب سے پکارے جانے لگے تھے۔

باب ٦

محمود کی تلوار یا درویش کی زبان

****

حضرت داتا صاحب کے زمانہ میں اسلامی دنیا کے مشرقی حصہ میں اسلام کے فروغ کا سہرا محمود کے سر باندھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ شمالی ہند میں اسلام کی اشاعت اور اسلامی ثقافت کی بنیاد محمود غزنوی کی مرہون منت ہے۔ ایم۔ ناظم نے اس کے حق میں مفصّل بحث کی ہے اور ان کارناموں کی بنا پر اسے ہندوستان میں اسلام کا پہلا ہیرو قرار دیا ہے[1]۔

محمود غزنوی نے اسلام کی اشاعت کے لئے کیا کچھ کیا؟ اس پر بعد میں بحث کی جائے گی — پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ محمود نے غزنی اور لاہور میں جس ثقافت کو فروغ دیا، کیا وہ واقعی اسلامی ثقافت تھی؟ اس زمانے میں ثقافت کا سرچشمہ دربار اور طبقہ امرا تھا۔ ان کیطرف سے شاعروں اور دوسرے فنکاروں کی سرپرستی ادب نوازی کے ذیل میں نہیں آتی۔ جدید اصطلاح کے مطابق شعر و ادب کو ابلاغ عامہ اور حکمرانوں کی پبلسٹی کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا — "چہار مقالہ" کے مطابق اس سرپرستی کیوجہ سے امرا کو شہرت حاصل ہوتی تھی، اسیطرح شاعر بھی سلاطین سے انعام و اکرام حاصل کر کے شہرت حاصل کرتے تھے[2]۔

خدانخواستہ غزنویوں کی کردار کشی مقصود نہیں — دکھانا صرف یہ چاہتا ہوں — کہ محمود مجاہد تو تھا، مبلغ اسلام نہ تھا، اس کی نجی زندگی اور درباری معاشرت اسلامی تعلیمات

سے کس قدر مطابقت رکھتی تھی؟ دربار کی مجالسِ "نشاط و شرب" میں شراب پیش کی جاتی تھی جسے سلطان اور درباری بے دریغ پیتے تھے۔ محمود کے دَور میں ساقیوں کا سردار ایاز تھا۔ بیہقی نے مسعود کے دربار میں ایک جشن (۴۲۹ھ/۱۰۳۸ء) کا چشم دید حال قلمبند کیا ہے۔ وہ دربار کی آرائش و زیبائش کی تصویر کشی کے بعد لکھتا ہے:

"امیر مسعود لباس تبدیل کر کے آیا اور مرصع ایوان میں دسترخوان پر رونق افروز ہوا، امراء اور معززین بھی دسترخوان پر بیٹھے۔ ایوان کے باہر بھی دسترخوان بچھا دیئے گئے جن پر فوجی افسر بیٹھ گئے۔ مطربوں نے ساز چھیڑے تو شراب پانی کی طرح بہنے لگی۔ جو لوگ مدہوش ہو گئے وہ دسترخوان سے اٹھ گئے۔ امیر مسعود بھی مستی سے سرشار اُٹھے اور گھوڑے پر سوار ہو کر باغ میں پہنچے۔ جہاں پھر پہلے جیسی شاندار مجلس آراستہ ہوئی۔ ندیموں کے آنے پر پھر شراب کا دَور چلا۔ نماز مغرب تک سبھی شراب پیتے رہے"[۳]

مسعود کی کثرت شراب نوشی کا گلہ اس کے وزیر احمد بن عبد الصمد نے بھی کیا ہے[۴]۔ اسی طرح لاہور کے دربار میں امراء اور فنکار شراب پی کر جو خرمستیاں کرتے تھے، اسکا ذکر پانچویں باب میں آچکا ہے۔ صاحب 'چہار مقالہ' محمود کے تجی ذوق کا اشارہ کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کرتا ہے کہ محمود کو ایاز سے جو عشق تھا۔ سب جانتے ہیں۔ محمود شرع سے تجاوز کرنا نہ چاہتا تھا، مگر ایک روز بے قرار ہو کر ایاز کو آغوش میں لے لیا۔ محتسبوں نے کہا کہ محمود نے عشق میں فسق شامل کر دیا ہے۔ محمود نے ندامت میں ایاز کی زلفیں کٹوا دیں[۵]۔

شیخ فرید الدین عطارؒ اور مولانا رومیؒ محمود و ایاز کے تعلقات کو اور ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور صرف انہی دو بزرگوں کی سفارش اسے اس الزام سے بری قرار دے

سکتی ہے ــــ تاہم یہ خرابی اس زمانہ کے طبقۂ امرا میں بڑی عام تھی ــــ مسعود اپنے تقریباً ہم عمر چچا یوسف بن سبکتگین سے سیاسی خطرہ محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے یوسف کی جنسی بے راہ روی کا سراغ لگانے کے لئے اس کے محبوب غلام زادے کو مخبری پر آمادہ کیا۔ ورنہ یوسف کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر خود اس سے اپنی بے راہ روی کا اعتراف کرایا۔[۲۴] محمود غزنوی کے سنی اور حنفی العقیدہ ہونے میں کوئی کلام نہیں ــــ اس نے قرآن کی تعلیم مشہور حنفی عالم قاضی ابونصر صیینی سے حاصل کی تھی۔ عتبی کا بیان ہے کہ سلطان محمود کو مختلف دینی امور پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ کوئی بدعت اس کی نظر سے بچ نہیں سکتی تھی[۲۵] ــــ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دن دربار میں دینی امور زیر بحث تھے کہ ایک محدث سے بلا اجازت لب کشائی کا "گناہ" سرزد ہوگیا۔ محمود نے انھیں اس بے رحمی سے مارا کہ ساری عمر کے لئے سماعت سے محروم ہو گئے[۲۶]

مشہور حنفی فقیہہ اور امام اعظمؒ کے عزیز شاگرد قاضی ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج" میں مالگزاری کے جو بہر اصول متعین کئے تھے ــــ محمود اور اسکے جانشین ان پر برائے نام بھی عمل نہ کرتے تھے۔ اس الزام سے ان کے پیش رو بھی بری نہیں ہیں ــــ لیکن غزنوی سلاطین نے اپنے خزانے بھرنے کے لئے عوام پر ان کے مقدور سے زیادہ ٹیکس عائد کئے [illegible] وصولی کے لئے جبر و تشدد کا کوئی حربہ بے استعمال نہ [illegible] ۶-۱۰۰۵ء میں ملتان پر اس لئے قبضہ کیا کہ اس کا حاکم اسمعیلی ہوگیا تھا۔ اس نے ملتان کو لوٹ مار سے بچانے کے لئے شہریوں سے دو کروڑ درہم، اور دوسری روایت کے مطابق بیس ہزار درہم وصول کئے[۲۷]۔ ظاہر ہے کہ یہ جرمانہ صرف اسمٰعیلیوں سے ہی وصول نہ کیا گیا ہوگا۔

۳ ہندوؤں کا اسلام سے تنفر

کیا شمالی ہند میں اسلام کی اشاعت محمود کا کارنامہ ہے؟ تاریخی حقائق کو ملحوظ رکھیں

توہمیں پروفیسر حبیب کی رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ محمود کی پالیسی کے نتیجے میں ــــ ہندوستان کے غیر مسلموں نے اسلام کی آواز سننے سے پہلے ہی اسلام کو مسترد کر دیا تھا۔[۱۰] محمودی تلوار کے ڈر سے انند پال کے بیٹے سکھ پال نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور محمود نے انعام میں اسے بھیرہ کی حکومت عطا کر دی تھی، لیکن سلطان کے واپس پلٹتے ہی وہ اسلام سے منحرف ہو گیا، اور اس نے محمود کے تمام مسلمان افسروں کو نکال دیا[۱۱] ــــ اسیطرح اگر محمود کی تلوار کے ڈر سے کچھ اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے ہوں تو اسے اسلام کی اشاعت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ہندوؤں کے ذہنوں پر محمودی حملوں کا جو ردعمل ہوا وہ البیرونی کے مشاہدہ کے مطابق یہ تھا کہ:

> "ہندو مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو مسلمان کے نام سے ڈراتی ہیں ــــ ہندو اپنے لئے اس سے بڑی ذلت کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ انھیں مسلمانوں کا لباس پہننے پر مجبور کیا جائے۔"

البیرونی اس کا سبب یہ بتاتا ہے کہ:

> "محمود نے اس ملک کی خوشحالی کو مکمل طور پر برباد کر دیا ہے۔ محمود کی حیرت ناک مہموں کے نتیجے میں ہندو مٹی کے ذرات کی طرح ہر سو بکھر گئے ہیں اور ان کا ذکر لوگوں کی زبان پر قصۂ پارینہ بن گیا ہے۔ ان خاک بسر ہندوؤں کے دل تمام مسلمانوں کے خلاف نفرت سے لبریز ہیں۔"[۱۲]

ہندوؤں کی یہ نفرت بے وجہ نہ تھی۔ محمود نے ۳۹۹ھ/۹-۱۰۰۸ء میں کانگڑہ سے سات کروڑ درہم کے سکے اور ستر ہزار من (یہ من پاکستان کے ساڑھے بارہ سیر کے برابر تھا)

سونا چاندی غنیمت میں حاصل کی۔ اس سلسلہ میں سومناتھ کی مثال بھی پیش نظر ہے، کہ وہاں سے دو کروڑ دینار کا مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا۔ باقی مہموں میں جو دولت ہاتھ لگی وہ علیحدہ ہے۔ ۴۰۹ھ/ ۱۰۱۸ء میں قنوج کی فتح سے منجملہ دیگر اموال کے قریب ہزار غلام ہاتھ آئے جو غزنی میں دو سے دس درہم تک میں بک گئے۔[۱۳]

تاہم اس تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ باسورتھ کے نزدیک ہندوستان صدیوں سے کانوں سے نکلنے اور تجارت سے حاصل ہونے والے سونے کو مندروں میں دفن کر رہا تھا اس وجہ سے تجارت کا توازن برقرار نہ رہا تھا لیکن محمود کے حملوں سے صورت حال بدل گئی — صدیوں سے منجمد سونے کے گردش میں آجانے سے صنعت و تجارت میں جان پیدا ہو گئی اور تجارت کا توازن جو ہمیشہ ہندوستان کے حق میں رہتا تھا اب متوازن ہو گیا۔[۱۴]

اسی طرح اس دور میں غلامی کلنک کا ٹیکا نہ تھی — آلِ سبکتگین خود غلام تھے۔ محمود کی مستقل فوج صرف غلاموں پر مشتمل تھی۔ دربار اور حرم میں غلاموں کی بھرمار تھی محمود کا محبوب ایاز غلام ہی تھا۔ غرضیکہ غلامی کوئی ایسی چیز نہیں جس کے لئے محمود کو مطعون کیا جائے ہے

۱۰ محمود کی ہنود نوازی

محمود غزنوی نے اگر ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لئے تلوار استعمال کی ہوتی تو ہمیں مفتوحہ علاقوں میں نہ سہی، دارالحکومت غزنی میں تو کوئی ہندو نہ ملتا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ غزنی میں محمود کے فیل خانہ کا سارا عملہ ہندو تھا، اور ان کے انچارج کا رتبہ حاجب کے برابر تھا۔[۱۵] حاجب بزرگ کے عہدہ سے نیچے کے تمام عہدے ہندوؤں پر کھلے تھے۔

عربوں اور کردوں کی طرح ہندوؤں کا بھی ایک لشکر تھا جس کا سربراہ "سپہ سالارِ ہندواں" کہلاتا تھا۔ بعض معاملوں میں مسلمانوں سے زیادہ ان ہندوؤں پر اعتماد کیا جاتا تھا اور وہ بجا طور پر اس اعتماد کے لائق تھے۔ سنہ ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء میں محمود کے اپنے جانشین محمد کو امیر ایاز اور ابو علی دایہ جیسے مسلمان امرا بھی چھوڑ گئے تو ہندوؤں نے محمد کا ساتھ دیا۔ ان کا سالار سُندر ایاز کے تعاقب میں مارا گیا۔ اسی طرح ایک باغی ترک جرنیل اسغ تگین پکڑا گیا تو اسے بحفاظت غزنی پہنچانے کے لئے ہندوؤں کے ایک دستہ ہی کو لائق اعتماد خیال کیا گیا۔ سنہ ۴۲۵ھ / ۱۰۳۳ء میں لاہور کے سپہ سالار احمد نیال تگین نے علم بغاوت بلند کیا تو اس کی سرکوبی کے لئے لاہور ہی کے ایک ہندو تلک حجام کو غزنی سے اس شان و شوکت سے روانہ کیا کہ مسلمان امراء دم بخود رہ گئے۔ احمد کا سر کاٹ کر لانے پر سلطان مسعود نے خود اپنے ہاتھوں سے تلک کے گلے میں جواہرات کا طوق پہنایا اور اسے مستقلاً سالار ہندواں کے منصب پر فائز کیا۔

ان واقعات سے بہت پہلے سلطان محمود غزنوی نے سنہ ۳۹۴ھ / سنہ ۱۰۰۳ء میں سیستان میں ایک بغاوت فرو کرنے کے لئے ہندوؤں کے لشکر کو بھیجا، جس نے زرنج میں مسلمانوں کا نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل عام کیا۔ حتیٰ کہ جامع مسجد میں پناہ گزین مسلمانوں اور گرجوں میں پناہ گزین عیسائیوں کو بھی نہ چھوڑا۔ محمود کے دور میں ہی غزنی میں ہندوؤں کا پورا محلہ آباد ہو گیا تھا۔ جہاں انھیں بت پرستی کی مکمل آزادی تھی۔ دار الحکومت میں ہندوستانی امور کے لئے ایک الگ شعبہ قائم ہو گیا تھا، جس میں ہندو ترجمانی اور دبیری کے عہدوں پر فائز کئے گئے۔[۱۴]

داتا صاحب کے عہد کے سکے

محمود اور اس کے جانشینوں کی اس رواداری کو جدید سیاسی اصطلاح میں سیکولرازم ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت وہ سکے ہیں جو لطیف کے بقول لاہور کے عجائب گھر

میں محفوظ ہیں ـــــ میں اپنی پوری کوشش کے باوجود عجائب گھر کے موجودہ (۱۹۷۴ء) ناظم کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ ان سکوں کی تصویر لینے کی اجازت نہیں دیتے تو نہ سہی ان کی ایک جھلک تو دکھا دیں۔ خدا کرے یہ بیش بہا خزانہ محفوظ ہو ـــــ

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا، اصل بات یہ ہے کہ لاہور میں مضروب ہونے والے سکوں پر دو زبانوں میں عبارت لکھی ہے: ایک طرف عربی میں اور دوسری طرف دیوناگری میں۔

"ادیکت ابکم محمد اوتار نرپت محمود"

جسکا ترجمہ یہ ہے: "کہ اللہ ایک ہے ـــ محمدؐ اس کا اوتار ہے اور محمود بادشاہ"
اسکے علاوہ سال ضرب بھی دیوناگری میں لکھا ہے ـــ یہی نہیں بلکہ محمود سے لیکر سلطان ابراہیم تک کے سکوں پر دیوناگری عبارت کے ساتھ "شیوجی کی سواری کے بیل "نندی" کی تصویر منقش ہے۔[۱۷]

توسیع سلطنت یا اشاعتِ دین؟

سلطان محمود غزنوی کے "داعیٔ امیر المومنین" ـــ "یمین الدولہ و امین الملت" ـــ "نظام الدین" ـــ "ناصر الحق" اور "کہف الدولہ والاسلام" جیسے القابات سے اس کی انتظامیہ کا سیکولر کردار نظروں سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے ـــ بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ البیرونی جیسے فضلاء کی طرح اس زمانے کے بعض اہل اللہ بھی محمود غزنوی کے غزوات کو کشور کشائی سے زیادہ رتبہ دینے کو تیار نہ تھے۔

حضرت داتا صاحبؒ نے کشف المحجوب میں صوفیائے متاخرین کے اماموں میں خراسان کے حضرت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانی رح کے حالات قلمبند کیے ہیں[۱۸]۔ مورخ فرشتہ نے "تاریخ بناکتی" کے حوالے سے حضرت خرقانیؒ سے سلطان محمود کی ملاقات کا حال لکھا ہے، کہ محمود خاص ان کی زیارت کے لیے خرقان گیا۔ اسے احساس تھا کہ یہ درویش، بادشاہ کو خاطر میں نہیں لائے گا، لہذا جس قاصد کو بلانے بھیجا اسے تاکید کر دی کہ اگر حضرت خرقانی بیرت

یہاں آنے سے انکار کریں، تو یہ آیت سنانا کہ:

"اے ایمان والو! اطاعت کرو خدا کی رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم پر حاکم ہوں"

حضرت خرقانی رح نے توقع کے مطابق محمود کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ قاصد نے وہ آیت پڑھی تو فرمایا:

"محمود کو جا کر کہہ دینا کہ میں اب تک اللہ کی اطاعت میں اسقدر مستغرق ہوں کہ اطاعتِ رسول ص کے مرتبہ تک نہ پہنچ سکنے کی بڑی ندامت ہے۔ بھلا اس حالت میں حاکم کی اطاعت پر کیسے توجّہ دے سکتا ہوں"

محمود یہ سنکر خود ان کی خدمت میں پہنچا، مگر اسطرح کہ بغرضِ امتحان ایاز کو اپنا لباس پہنا کر بادشاہ بنا دیا اور خود ایاز کے کپڑے پہنکر غلام بن گیا ـــ حضرت خرقانی رح نے محمود کو پہچان لیا اور باتوں ہی باتوں میں اس پر واضح کر دیا کہ ان کے نزدیک محمود اور ایک عام مسلمان میں کوئی فرق نہیں ـــ محمود نے ھدیہ پیش کیا تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ محمود نے تبرک مانگا تو اپنی گدڑی عطا فرمائی۔

فرشتہ لکھتا ہے کہ: سومناتھ کے معرکے میں جب سلطان محمود کو اپنی شکست یقینی دکھائی دی تو بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوا، اور حضرت خرقانی کی گدڑی کو ہاتھ میں لے کر فتح کی دُعا مانگی جو قبول ہوئی ـــ اسی رات شیخ خرقانی رح خواب میں آئے اور محمود سے کہا:

"اے محمود! تو نے میری گدڑی کی آبرو لوٹ لی ہے۔ اگر تو محض اپنی فتح کی دعا مانگنے کے بجائے سارے غیر مسلموں کے قبول اسلام کی دعا مانگتا تو وہ بھی قبول ہو جاتی" [۱۹]

محمود کے جہاد پر شبہ

مؤرخ ابوالفضل بیہقی (المتوفی ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء) نے ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اہل اللہ کو محمودی غزوات کے مطابق شریعت ہونے پر بھی شک تھا۔ بیہقی لکھتا ہے کہ سلطان مسعود کو خبر ملی کہ بست کے قاضی ابوالحسن کا ہاتھ بڑا تنگ ہے اور وہ کسی کی مدد بھی قبول نہیں کرتے — ایک دن سلطان نے بیہقی کو طلب کر کے سونے کی ایک ایک ہزار ڈلیوں کی دو تھیلیاں دیں۔ ان میں سے ہر ڈلی کا وزن، ایک مثقال (ساڑھے پانچ ماشے تقریباً۔ بیرونی۔ الہند جلد اول ص۲۱۶) تھا۔ سلطان نے کہا یہ تھیلیاں ابونصر (وزیر) کے پاس لیجاؤ، کہ ان میں سے ایک قاضی ابوالحسن کو اور دوسری ان کے فرزند کو دے دے — ابونصر سے کہنا کہ یہ وہ سونا ہے جو میرے والد نے ہندوستان میں اپنے غزوات کے دوران کفار کے بتوں کو توڑ کر حاصل کیا تھا، لہذا اس کے عین حلال ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ابونصر مشکان نے سلطان کی فراخدلی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے قاضی ابوالحسن اور ان کے بیٹے کو طلب کیا، اور سلطان کا عطیہ پیش کیا — لیکن قاضی صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ :

> "میں یہ نہیں کہتا کہ ضرورت مند نہیں ہوں مگر اپنے حال پر قانع ہوں روز محشر قریب ہے اور میں اس سونے کا حساب نہیں دے سکوں گا — لہذا میں پاس ادب سے انہیں قبول کر کے واپس کرتا ہوں۔"

ابونصر مشکان نے کہا :

> "سبحان اللہ! یہ سونا سلطان محمود نے بزور شمشیر کفار کے بتوں کو توڑ کر حاصل کیا ہے اور امیر المومنین (خلیفہ بغداد) نے بھی سلطان محمود کے جہاد کی توثیق کی ہے لیکن آپ ہیں کہ اسے قبول کرتے سے

انکار کر رہے ہیں !؟

قاضی صاحب نے جواب دیا :

" اللہ سلطان کی عمر دراز کرے ، اصل بات یہ ہے کہ امیر المومنین کا حال میرے حال سے مختلف ہے - وہ مالک ملک ہے - علاوہ ازیں آپ (وزیر ابونصر) امیر محمود کے ہمرکاب رہے ہیں میں نہیں رہا مجھے کیا پتہ کہ یہ مہمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق انجام دی گئی تھیں کہ نہیں - میں کسی حالت میں بھی یہ سونا اور اسکی ذمہ داری قبول نہیں کروں گا "[۲۰]

ہمارے داتا صاحبؒ کا رویہ بھی کم و بیش یہی تھا — آپ کے زمانہ میں محمود اور اس کے جانشینوں کے " غزوات " کا بڑا شہرہ تھا ، لیکن داتا صاحب ان سے ذرا بھی متاثر دکھائی نہیں دیتے — کشف المحجوب میں اسلامی عقائد کے تمام مبادیات مثلاً ایمان — توحید - رسالت - حج - روزہ - نماز اور زکوٰۃ پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے لیکن جہاد کا کہیں ذکر نہیں فرمایا - اگر کیا ہے تو نفس کے خلاف جہاد کا — لکھتے ہیں :

" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کے لئے اپنے نفس سے جہاد کیا - نیز آنحضرتؐ نے فرمایا ، ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے ہے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ جہادِ اکبر کیا ہے ؟ تو حضورؐ نے فرمایا : " سنو ! وہ مجاہدۂ نفس ہے " — رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مجاہدۂ نفس کو جہاد پر اس لئے فضیلت دی ہے کہ اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے - وجہ یہ ہے کہ جہادِ خواہش نفس کو مٹانے کے مترادف ہے اور مجاہدۂ نفس کو مغلوب کرنے کے "[۲۱]

اگر ایک لحظے کے لئے فرض کرلیا جائے کہ سلطان محمود کے غزوات کا مقصد اشاعت دین تھا تب بھی داتا صاحب اس کے طریق کار اور نتائج سے مطمئن دکھائی نہیں دیتے ۔ اسکا اظہار "باب المحبتہ وما تیعلق بہا" کی ایک عبارت سے ہوتا ہے آپ نے محبت کے بارے میں بعض بزرگوں کے اقوال بیان کرتے ہوئے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ :

"ہندوؤں میں محمود کا غلام بننے کے مقابلہ میں محبت کا غلام بننے کی رغبت زیادہ نظر آتی ہے[۱۲]"

امر واقعہ بھی یہی ہے کہ محمود نے ہندوؤں کا ملک اور ان کے جسم تو بے شک فتح کر لیے تھے مگر وہ دلوں اور ذہنوں کی تسخیر میں ناکام رہا۔ یہ فریضہ حضرت داتا صاحب نے انجام دیا اور اس خوبی کے ساتھ کہ آج ایک ہزار سال بعد لوگ محمود غزنوی کا نام تو بھول گئے ہیں لیکن داتا صاحب کا نام لاکھوں زبانوں پر جاری ہے۔

باب ۷

کشف المحجوب

****

حضرت داتا صاحب کی کشف المحجوب تصوّف کے موضوع پر فارسی کی سب سے پرانی تصنیف ہے۔ جب تک اس سے پرانی کتاب دستیاب نہیں ہوتی، تب تک اس کتاب کا دعوٰئے اولیت برقرار رہے گا۔

اسلام میں تصوّف کا تصوّر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ مبارک میں ہی قائم ہوگیا تھا —— تاہم اس اصطلاح کا استعمال دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا اور اس فن کے مختلف پہلوؤں پر تصنیفات کا سلسلہ بھی اسی زمانہ میں جاری ہوگیا تھا۔ اس میں بعض ایسے عقائد اور مسائل بھی شامل ہو گئے تھے جن کا اسلام سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا — چوتھی صدی ہجری کی پہلی دہائی (ذیقعد ۳۰۹ھ / مارچ ۹۲۲ء) میں حسین بن منصور حلاج کے قتل نے صوفیوں کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ چنانچہ یہ امر ثابت کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ اصل تصوّف کیا ہے اور یہ کہ طریقت اور شریعت کا باہمی تعلق کیا ہے؟

اس مقصد کیلئے تصوف کے موضوع پر جامع تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تذکرہ نویس بتاتے ہیں کہ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف شیخ ابوبکر محمد بن ابراہیم بخاری کلاباذیؒ (المتوفی ۳۸۰ھ / ۹۱-۹۹۰ء) کی "التعرف فی مذہب التصوف" تھی۔ عین اسی زمانہ میں شیخ ابوالنصر سراجؒ (المتوفی ۳۷۸ھ / ۹۸۸ء) نے اپنی شہرہ آفاق "کتاب اللمع فی التصوف" تالیف کی - ان دونوں میں سے کونسی

کتاب پہلے لکھی گئی؟ اسکا فیصلہ محال ہے۔ ہمارے داتا صاحب نے کشف المحجوب میں شیخ ابونصر سراج کا ذکر کیا ہے اور ان کی "کتاب اللمع" سے ایک عبارت نقل کی ہے (صفحہ ۳۰۴ اور ۳۸۱) ہمارے مطلب کی بات صرف اتنی ہے کہ تصوف کے موضوع پر یہ دونوں کتابیں عربی میں لکھی گئی تھیں۔

"کشف المحجوب" کی فارسی میں اوّلیت کو شیخ ابوبکر کلاباذی کی "التعرف" کی "شرح تعرف" کی بنیاد پر چیلنج کیا گیا ہے — مولوی شفیع مرحوم نے لکھا ہے کہ

> "تصوف پر پہلی فارسی کتاب جو ہم تک پہنچی ہے وہ ابوابراہیم اسمٰعیل مستملی بخاری متوفی ۴۳۴ھ (۴۳-۱۰۴۲ء) کی کتاب "شرح تعرف" ہے جو دیوبند میں چھپی مگر پشاور یونیورسٹی کے نسخے سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند والے نسخے میں کتاب کی پرانی زبان کو بدل دیا گیا ہے۔ "شرح تعرف" کے بعد "کشف المحجوب" ہے جو فارسی میں تصوّف کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے[1]"

علماء اس خیال کو لے اُڑے — آقائے عبدالحی حبیبی نے اس موضوع پر اپنے مقالہ "یکے از قدیمترین نسخ زبان پارسی اواخر دورہ سامانی" میں "شرح تعرف" اور اس کے مختلف نسخوں پر بحث و تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی ہے کہ پشاور یونیورسٹی والا قلمی نسخہ سب سے پہلا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "اب تک علی ہجویری کی "کشف المحجوب" فارسی زبان میں تصوّف کی اول ترین اور قدیم ترین کتاب شمار ہوتی ہے۔ چونکہ ہجویری کا سال وفات ۴۶۵ھ ہے، اس وجہ سے مستملی کی یہ شرح تعرف کشف المحجوب سے تقریباً اسی سال قدیم تر ہے۔ یہ دورِ غزنوی کی تالیف ہے اور وہ عہد سامانی کی[2]"

مولانا ہاشمی مرحوم نے بھی یہ رائے قبول کر لی اور یہ معذرت پیش کرنا ضروری خیال

کیا کہ : "کشف المحجوب" کی فضیلت فی الواقع محض اس کی قدامت پر
قائم نہیں بلکہ اسکے گوناگوں اوصاف معنوی پر مبنی ہے[۳]"

ان علماء نے کشف المحجوب" کی قدامت کا فیصلہ کرتے وقت اس نکتے کو ملحوظ
نہیں رکھا کہ مستملی کی کتاب "شرح" ہے اور داتا صاحب کی کتاب "طبعزاد" ہے۔
ترجمہ، شرح اور طبعزاد میں جو فرق ہے اسے ملحوظ رکھا جائے تو کشف المحجوب کی
اولیت برقرار رہتی ہے

قدیم ترین نسخہ

"کشف المحجوب" ہر عہد میں مطلوب ومقبول رہی ہے۔ مولوی محمد شفیع مرحوم
کے ذاتی کتب خانہ میں "کشف المحجوب" کی قدیم ترین نقل موجود ہے جسے ان کے فرزند احمد
ربانی نے شائع کر دیا ہے۔ اس نسخے کی قدامت سے قطع نظر خوبی یہ ہے کہ اسے حضرت
بہاء الدین زکریا ملتانی جیسے ولی اللہ نے ۶۶۴ھ/ ۶-۱۲۶۵ء میں اپنے قلم سے نقل
کیا تھا۔

کشف المحجوب کو خراجِ تحسین

کشف المحجوب کو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ (المتوفی ۷۲۵ھ/
۱۳۲۵ء) نے ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے کہ :

"کشف المحجوب شیخ علی ہجویریؒ کی تصنیف ہے۔ اگر کسی کا مرشد
نہ ہو تو اس کتاب کے مطالعہ کی برکت سے مل جائے گا۔ میں

نے اس کتاب کا بہ تمام مطالعہ کیا ہے[۳۸]"

اسی عہد کا ایک مؤرخ ضیاء الدین برنی "تاریخ فیروز شاہی" میں ۷۵۸ھ/۱۳۵۷ء کے نواح میں لکھتا ہے کہ :

"عہد علائی کے آخری چند سالوں میں لوگوں کی حالت اس قدر بدل گئی تھی کہ کبیرہ گناہ بمنزلہ کفر ہو گئے تھے۔ اشراف و اکابر سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ قوت القلوب۔ احیاء العلوم احیاء العلوم کا ترجمہ عوارف۔ کشف المحجوب، شرح تعرف وغیرہ کے بہت زیادہ خریدار پیدا ہو گئے تھے[۳۹]"

حضرت شرف الدین احمد منیری رح (المتوفی ۷۸۲ھ/۱۳۸۱ء) نے اپنے مکتوبات میں جابجا کشف المحجوب کا ذکر کیا ہے اور حضرت جہانگیر اشرف سمنانی رح (المتوفی ۸۰۸ھ/۱۴۰۵ء) کے ملفوظات "لطائف اشرفی" میں بھی اس کتاب کے حوالے بکثرت موجود ہیں[۴۰]

ملا نور الدین جامی نے ۸۸۳ھ/۱۴۷۸ء میں "نفحات الانس" مکمل کی جو دراصل ہمارے داتا صاحب کے ایک معاصر خواجہ عبداللہ انصاری رح ہروی (متوفی ۴۸۱ھ/۱۰۸۹ء) کی تالیف "طبقات صوفیہ" پر مبنی ہے مگر جامی رح نے اس میں بزرگان مابعد کے تراجم بھی شامل کر دیئے ــــ اس میں داتا صاحب کا تعارف "کشف المحجوب" کے حوالہ سے کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اس فن کی مشہور اور معتبر کتابوں میں ہے اس لئے کہ بہت سے لطائف اور حقائق اس کتاب میں جمع کئے ہیں[۴۱]

شہزادہ دارا شکوہ نے ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں "سفینۃ الاولیاء" مکمل کی تھی اس میں وہ کشف المحجوب کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"کسی کو اس کتاب کی خوبیوں میں کلام نہیں۔ یہ درحقیقت کامل رہنما ہے اور کتب تصوف میں ایک مرشد کامل ہے"

فارسی میں ایسی کامل تصنیف کوئی نہیں۸"

لاہور کا اعزاز

لاہور کو یہ فخر حاصل ہے کہ ایسی بلند پایہ اور بزرگ کتاب اس کی سرزمین پر لکھی گئی۔ داتا صاحب ایک دنیا کا سفر کرنے کے بعد لاہور میں مقیم ہوئے تھے — یہاں اقامت سے صوفی کی وہ حالت مراد ہے جسے سفروں کی تکمیل کے بعد اختیار کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"سب درویش دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک مقیم دوسرے مسافر۔ مشائخ کا طریق یہ ہے کہ مسافر مقیموں کو اپنے اوپر ترجیح دیں، اس لئے کہ مسافر اپنے نصیبے کے واسطے جا رہے ہیں اور مقیم حق کی خدمت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسافری میں طلب اور تلاش پائی جاتی ہے اور مقیموں میں مطلوب کے حاصل ہو جانے کی نشانی — پس فضیلت اس کو حاصل ہوگی جس نے مطلوب کو پا لیا اور بیٹھ گیا۹"

اگرچہ یہ کوئی شرط نہیں کہ مقیم اقامت ترک نہیں کر سکتا مگر قرائن بتاتے ہیں کہ داتا صاحب ایک دنیا کی سیاحت کے بعد پنجاب تشریف لائے اور یہاں کے مختلف علاقوں کو دیکھنے کے بعد لاہور میں مقیم ہو گئے اور دم واپسیں تک یہیں رہے اسی باب میں آگے چل کر اپنے ایک عہد کا اعلان کیا ہے:

"مجھ علی بن عثمان جلابی کو اپنے سفروں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بات ناگوار اور رنج دینے والی نہ تھی کہ جاہل خادم — اور بے خوف مقیم کبھی مجھ کو اپنے ساتھ لے لیتے۔ کبھی اس خواجہ

کے گھر پہنچا تو کبھی اس دہقان کے گھر۔ میں دلی کراہت کے ساتھ چلا جاتا اور بظاہر درگزر کرتا۔ پھر مقیم لوگ مجھ سے جو بے قاعدگیاں کرتے تھے میں ان کی وجہ سے دل میں عہد کر لیتا، کہ اگر میں کسی وقت مقیم ہو جاؤں گا تو مسافروں سے کبھی ایسا سلوک روا نہ رکھوں گا۔"[۱۰]

داتا صاحب رح نے لاہور میں اقامت اختیار کرنے کے بعد دعوت و ارشاد کی جو مسند بچھائی ـــــ اس کے نتیجے میں ہزاروں افراد نے اسلام قبول کیا۔ داراشکوہ نے لاہور میں مسجد تعمیر کرنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی مستقل اقامت کا ثبوت فراہم کرتی ہے کشف المحجوب کی تصنیف اسی دور میں مکمل ہوئی ہوگی۔

کشف المحجوب کے لاہور میں لکھے جانے کی واضح شہادت بھی بعض نسخوں سے ملتی ہے۔ آپ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس وقت زیادہ لکھنا ممکن نہیں کیونکہ میری کتابیں غزنی میں رہ گئی ہیں اور میں یہاں دیار ہند کے شہر لاہور میں جو ملتان کے مضافات میں ہے ناجنسوں کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔"

نکلسن نے کشف المحجوب کے انگریزی ترجمہ کے پیش لفظ میں ان سطور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

"کشف المحجوب کا تعلق مصنف کی عمر کے آخری برسوں سے ہے کم از کم اس کے ایک جزو کا تعلق تو لاہور میں قیام کے دنوں سے ہے۔"[۱۱]

نکلسن کے جملے کی ساخت یہ بتاتی ہے کہ اس نے جزو کا ذکر از راہ احتیاط کیا ہے۔ لیکن اس کی یہ احتیاط بعض علما کے لئے شرط بن گئی۔ مثلاً مولوی محمد شفیع مرحوم نے

کشف المحجوب کے مقدمہ اور اپنی تشریحی تقاریر میں یہ بات کئی بار دہرائی ہے کہ کتاب کا ایک حصہ لاہور میں لکھا گیا تھا ـــ اس تکرار سے یہ تاثر ملتا ہے کہ گویا باقی حصہ لاہور میں نہیں لکھا گیا۔ غالباً اسی سے متاثر ہو کر محترم عبدالمجید یزدانی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ داتا صاحب "کتاب کی تالیف کے وقت اکثر و بیشتر ھجویر میں قیام پذیر رہے[۱۲]"

یادداشت کا کمال

داتا صاحب کے اس بیان سے کہ "کتابیں غزنی میں رہ گئی ہیں" ـــ یہ مترشح ہوتا ہے کہ کشف المحجوب حوالے کی کتابوں کے بغیر محض اپنی یادداشت سے لکھی گئی ہے، اور یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے ـــ تاہم مولوی محمد شفیع مرحوم لکھتے ہیں :

> "اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تحریر کتاب کے وقت، داتا صاحب کے پاس کوئی تحریری مواد مراجعت کے لئے موجود نہ تھا۔ درجنوں آیات شریفہ ۱۳۷ احادیث اور ۷۵ عربی اشعار جو اس کتاب میں آئے ہیں ـــ ان کا زبانی لکھ لینا تو چنداں دشوار نہ تھا مگر تقریباً تین سو اقوال مشائخ اور بیس اکیس کتابوں کی عبارتیں جو بقید مصنف کتاب میں درج ہیں ـــ ان کا حافظے سے درج کرنا قرین قیاس نہیں[۱۳]"

کشف المحجوب کے مطالعے سے ہم مولوی شفیع کے قول پر خود داتا صاحب کے قول کو ترجیح دینے پر مجبور ہیں۔ داتا صاحب نے اپنے حافظہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ آج کے زمانے میں حیران کن لگتا ہے مگر اس زمانے میں یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔ داتا صاحب نے خود کشف المحجوب میں حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر الخالدی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ علم تصوف کے فنون میں بہت بڑے فاضل اور مشائخ کے کلام کے حافظ تھے[۱۴]۔

اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ داتا صاحب کے زمانۂ حیات میں امام محمد بن محمد الغزالیؒ نے جرجان میں امام ابونصر کے درس میں جو نوٹس لئے تھے، واپسی میں ڈاکوؤں نے دوسرے سامان کے ساتھ لوٹ لئے تھے۔ امام غزالیؒ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا کہ میں اپنے اسباب اور سامان میں سے صرف اس مجموعہ کو مانگتا ہوں کیونکہ میں نے یہ سفر انہی کے لئے کیا ہے وہ ہنس پڑا، اور کہا :— "تم نے خاک سیکھا کہ ایک کاغذ نہ رہا تو کورے رہ گئے"— یہ کہہ کر اس نے کاغذات واپس کر دیئے — امام غزالیؒ پر اس طعنہ آمیز فقرے نے ہاتف غیبی کی آواز کا اثر کیا۔ چنانچہ وطن پہنچکر وہ یادداشتیں زبانی یاد کرنی شروع کیں، یہانتک کہ تین سال میں ان مسائل کے حافظ بن گئے۔[15]

کشف المحجوب میں داتا صاحب نے مشائخ اور ان کی تصانیف کے حوالے دینے کا جو التزام کیا ہے اسکے پیش نظر مولوی شفیع صاحب کو گمان گزرا کہ ساری کتاب کسی نہ کسی قسم کی "ریفرنس بک" کے بغیر نہ لکھی گئی ہوگی لیکن انھوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی — کہ کشف المحجوب میں کم از کم پچاس مقامات پر داتا صاحب کو مشائخ کے نام یا ان کے حوالے یاد نہ رہے چنانچہ انھیں " میں نے کسی بزرگ سے سنا ہے"— "ایک شیخ کا قول ہے" اور —" مجھے عبارت تو بعینہٖ یاد نہیں، مگر اس کا مطلب یہ ہے"— جیسے جملوں کا سہارا لینا پڑا ہے۔ یہ سلسلہ پوری کتاب میں پھیلا ہوا ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ کتاب واقعی حافظہ کی مدد سے لکھی گئی تھی۔ ان میں ایک یہ حوالہ ہے کہ :

"ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس سال سفر کیا میری کوئی نماز جماعت کے بغیر نہ ہوتی تھی اور ہر جمعہ کے روز میں ایک قصبہ میں ہوتا تھا۔"[16]

سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ —"خاکسار کا خیال ہے کہ حضرت شیخ ہجویریؒ نے ان سطور میں خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے۔"[17]

ترتیب و تسلسل

بعض علماء نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ کشف المحجوب مسلسل و متواتر لکھی جاتی رہی ــ یا مختلف اوقات میں اس کے مختلف اجزا قلمبند ہوتے رہے ۔ مولانا ہاشمی نے لکھا ہے کہ

"کشف المحجوب کو حقیقت میں چند مستقل اجزا کا مجموعہ سمجھنا درست ہوگا ۔ یہ اس بات کی دلیل ہوسکتی ہے کہ کتاب مختلف اوقات میں قلمبند کی گئی تھی"[۱۸]

ان دونوں خیالات کی تصدیق کم از کم کشف المحجوب سے تو نہیں ہوتی کیونکہ داتا صاحب نے کتاب کے شروع میں حمد و ثنا کے بعد ہی اعلان کر دیا ہے کہ میں نے کشف المحجوب لکھنے کے لئے استخارہ کیا ہے اور موضوع زیر بحث کئی ابواب میں منقسم ہو گیا ہے[۱۹] ۔ اس کے بعد اس خیال کی وضاحت کرنے کے بعد پہلے باب کی تمہید میں لکھتے ہیں :

"اب میں کتاب کو شروع کرتا ہوں اور تمہارا مقصود مخفی مقامات اور پردوں میں سے نکال کر ظاہر کرتا ہوں اور اسے لطیف بیان سے واضح کر دیتا ہوں اور اہل صناع کی عبارات کی تشریح کے ساتھ مشائخ صوفیہ کے کلام کا تھوڑا سا حصہ بھی اس کے ساتھ ملا کر بیان کروں گا اور عمدہ اور دلپذیر حکایات سے اسکی تائید بھی کروں گا ــ تاکہ تمہارا مقصود حاصل ہو جائے ــ علمائے ظواہر میں سے جو شخص اس کتاب میں غور کرے گا ، اسے معلوم ہو جائے گا کہ علم تصوف کی اصل قوی ہے اور اسکی شاخ بارآور ہے"[۲۰]

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب کا موضوع اور ترتیب کتاب شروع کرنے

سے پہلے ہی مصنف کے ذہن میں موجود تھی۔ اس کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اب میں اس گروہِ صوفیا کے اصول و رموز اور تصوف کے بارے میں بعض اشارات کی وضاحت کرتا ہوں۔ پھر ان مردانِ خدا کے نام اور مشائخ صوفیاء کے مذاہب کا اختلاف اور اس کے بعد حقائق تصوف اور معارف الٰہیہ اور معاملات شرعیہ اور اس کے بعد حتی الامکان ان کے مقامات کے رموز و آداب بیان کروں گا تاکہ تم پر اور دوسرے پڑھنے والوں پر طریق تصوف کی حقیقت منکشف ہوجائے"[۲۱]۔

(داتا صاحب نے اپنی کتاب میں ترتیب تسلسل اور تقدیم و تاخیر کا بڑا خیال رکھا ہے۔ مثلاً حضرت معروف کرخیؒ کا بیان اس جگہ نہیں کیا، جہاں کہ کرنا چاہیئے تھا۔ لہٰذا اس کا عذر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ترتیب کے لحاظ سے ان کا ذکر مقدم ہونا چاہیئے تھا لیکن میں نے دو پہلے بزرگ مؤلفین شیخ ابوعبدالرحمٰن السلمیؒ اور استاد امام ابوالقاسم قشیریؒ کی موافقت کی ہے"[۲۲])

کشف المحجوب کیوں لکھی ؟

داتا صاحب نے "کشف المحجوب" اپنے ایک ہم وطن ابوسعید ہجویریؒ کے سوال کے جواب میں لکھی ہے۔ ان کا سوال یہ تھا کہ :

"آپ میرے لئے طریقت و تصوف کی حقیقت — اہلِ تصوف کے مقامات، ان کے مذاہب و اقوال اور رموز و اشارات — اللہ کی محبت اور دلوں پر اسکے ظاہر ہونے کی کیفیت۔ اس کی

ماہیت کی دریافت سے انسانی عقلوں کے حجاب کا سبب
اس کی حقیقت سے نفس امّارہ کی فطرت اور برگزیدگی اور
پاکیزگی سے رُوح کا آرام اور دوسرے جو اُمور اس سے متعلق
ہیں بیان کیجئے[۲۳]"

ہمارے زمانہ کے تذکرہ نویس حضرت ابو سعید ہجویریؒ کے حالات کا سراغ لگانے میں ناکام ہو گئے ہیں ۔ ایک صدی پہلے کے ایک تذکرہ سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے ——— کہ داتا صاحب کے مزار کے پاس دو قبریں ہیں ۔ ان میں سے ایک شیخ احمد حمادی سرخسیؒ (؟) کی اور دوسری شیخ ابو سعید ہجویری کی ہے[۲۴] ——— انہی شیخ ابو سعید کے سوال کے جواب میں داتا صاحب نے کشف المحجوب لکھی تھی ۔

کشف المحجوب کا نام

داتا صاحبؒ نے اپنی کتاب کا نام "کشف المحجوب" تجویز کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ

"اصحاب بصیرت کتاب کے نام سے ہی اس کے مضامین و مطالب
سے آگاہ ہو جائیں ۔ یہ امر بھی واضح رہے کہ اولیاء اللہ اور عزیزان
درگاہ الٰہی کے سوا سارا عالم تحقیق کی رمز سے بالکل پردے میں ہے
چونکہ یہ کتاب راہ حق بیان کرنے اور رامر حق کی شرح کرنے ، اور
بشریت کے پردے کھولنے کے لئے لکھی گئی ہے ——— اس لئے
"کشف المحجوب" کے سوا کوئی دوسرا نام مناسب نہ تھا[۲۵]"

حال ہی میں ایرانیوں نے اس نام کا ایک قدیم مخطوطہ ڈھونڈ نکالا ہے ۔ یہ ابو یعقوب اسحٰق بن احمد سگزی کی تالیف "کشف المحجوب" ہے جو اسماعیلیہ عقائد پر لکھی گئی تھی ۔ ابو یعقوب چوتھی صدی ہجری میں ماوراء النہر کے اسمٰعیلی داعیوں میں سے ایک تھا ، اور بقول آقائے سعید

نفیسی اسے ۱۳۳۱ھ/ ۴-۲۲۹۹ء میں اسماعیلی ہونے کے جرم میں بخارا میں قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ کتاب تہران سے چھپ گئی ہے[۲۶]۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ داتا صاحب کو اس کتاب کا قطعاً علم نہ تھا — ورنہ وہ اپنی تصنیف کو یہ نام کبھی نہ دیتے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ داتا صاحب کے نزدیک یہ فرقہ زندیق اور ملحد ہے مثلاً فرماتے ہیں :

"ملحدین روح کو قدیم کہتے اور اس کی پرستش کرتے ہیں اور رُوح کو ایک جسم سے دوسرے کیطرف پلٹ جانے والا خیال کرتے ہیں شیعوں، قرامطیوں اور باطنی لوگوں کا بھی اجماع اسی پر ہے[۲۷]"

پھر لکھتے ہیں :

"ملحدین کا گروہ شریعت اور حقیقت کا ایک دوسرے کے بغیر قائم رہنا روا رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ جب حقیقت کا حال ظاہر ہوگیا تو شریعت اٹھ گئی۔ یہ کلام بعینہ مشبہین۔ قرامطہ شیعہ اور وسوسہ ڈالنے والوں کا ہے[۲۸]"

ایک اور جگہ لکھا ہے :

"آج کل کے مصری شیعہ کو مجوسیوں کا بچا کھچا سمجھئے۔ یہ وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو مجوسی کہا کرتے تھے اور یہ زندیق کا اسم ان کیلئے خاص ہوگیا ہے[۲۹]"

(۲۲) داتا صاحب کی کتابوں کا سرقہ

داتا صاحب نے کشف المحجوب میں ایک انوکھا اسلوب اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں اپنا ذکر آتا ہے یا کوئی ذاتی رائے پیش کرتے ہیں تو اپنا نام ضرور لکھتے ہیں۔ اسکی

وجہ یہ بتائی ہے کہ :

"اس علم سے جاہل لوگ جب کوئی ایسی کتاب دیکھتے ہیں جسمیں
مصنّف کا نام کئی جگہوں پر لکھا ہوا نہ ہو تو اس کی تصنیف اپنی
طرف منسوب کر لیتے ہیں — مجھے یہ حادثہ دو مرتبہ پیش آیا ہے
ایک دفعہ ایک شخص مجھ سے میرا دیوانِ شعر مانگ کر لے گیا۔ میرے
پاس اس کے سوا کوئی نقل نہ تھی۔ اس نے سرورق سے میرا نام
اڑا دیا، اور یوں میری محنت پر پانی پھیر دیا۔ اللہ اسے معاف کرے
مَیں نے طریقِ تصوّف میں ایک کتاب تالیف کی — اس کا نام
'منہاج الدین' رکھا مگر ایک رکیک مدعی نے کہ جسکا نام کہنے کے
لائق نہیں — اس کتاب پر سے میرا نام اڑا دیا اور عوام کے
سامنے یوں ظاہر کیا جیسے وہ کتاب خود اس نے لکھی ہو، خاص
لوگ اس بات پر ہنستے تھے۔ بالآخر اللہ تعالےٰ نے اس کا نام
طالبانِ درگاہ الٰہی کے دیوان سے کاٹ دیا[30]" (۲۲)

داتا صاحب کے زمانہ میں شغلِ تصنیف و تالیف اختیار کرنے کے دو اسباب تھے :
ایک سبب امراء، سلطان سے انعام کی امید تھی اور دوسرے سبب میں کوئی مالی مفاد
شامل نہ تھا — پہلا طریقہ شعراء و ادبا کا تھا، اور دوسرا طریقہ صوفیا کا۔ داتا صاحب
نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کہ :

"کتاب کی تصنیف و تالیف کا مقصد اسکے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ
اس کا نام زندہ رہے اور متعلم اس کے حق میں دعائے خیر کرتے
رہیں"

اور پھر جگہ جگہ اپنا نام لکھنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ :

"جب خواص کتاب دیکھیں گے اور ان کو معلوم ہوگا کہ مؤلف اس
علم کا عالم اور محقق گزرا ہے تو اس کا مطالعہ زیادہ توجہ سے کریں
گے اور اسے یاد رکھنے کی کوشش کریں گے ۔ اس طرح مصنف
اور پڑھنے والے دونوں کا مقصد بخوبی پورا ہوگا"[۲۱]

مجتہدانہ تصنیف

داتا صاحبؒ نے بتایا ہے کہ تصوف کے مختلف پہلوؤں پر متعدد صوفیاء نے کتابیں لکھی ہیں اور پھر ان کی نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کشف المحجوب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ جس کسی کے پاس بھی یہ کتاب موجود ہو اسے دوسری کتابوں کی ضرورت نہ رہے۔[۲۲] ہندوستان میں جہاں اسلام نیا نیا آیا تھا ۔ وہاں ایسی جامع کتاب کی ضرورت محتاج بیان نہیں کیونکہ یہاں صوفیوں کے اماموں کی کتابیں دستیاب نہ ہوں گی۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے "کشف المحجوب" کا اس کی ایک ہم عمر کتاب "القشیریہ" سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام ابوالقاسم قشیریؒ نے زیادہ تر متقدمین کے اقوال وحکایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کی ہے ۔ برخلاف اس کے مخدوم ہجویری ایک مجتہدانہ انداز سے اپنے ذاتی تجربات، مکاشفات، واردات، مجاہدات وغیرہ بھی قلمبند کرتے جاتے ہیں اور مباحث سلوک پر ردوقدح کرنے میں تامل نہیں کرتے ۔ اس لئے ان کی کتاب کی حیثیت محض ایک مجموعہ روایات و حکایات کی نہیں بلکہ ایک مستند محققانہ تصنیف کی ہے۔[۲۳] یقیناً اسی خوبی کی بنا پر حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے "کشف المحجوب" کو مرشد کا درجہ دیا ہے۔

دوسری تصنیفات

"کشف المحجوب" میں داتا صاحب نے اپنی جن سابقہ کتابوں کا حوالہ دیا ہے

ان کی تعداد نو ہے۔ داتا صاحبؒ نے ان کے جو نام اور موضوعات بیان کئے ہیں —— وہ حسب ذیل ہیں :

۱۔ دیوان شعر : کسی نے اسے مانگ کر اپنے نام منسوب کر لیا تھا (صفحہ ۲)

۲۔ منہاج الدین : یہ بھی چوری ہو گئی تھی۔ یہ کتاب طریق تصوف کے بیان میں تھی۔ (صفحہ ۲) اس میں اصحاب صُفّہ کے مناقب تفصیل سے بیان کئے ہیں (صفحہ ۸۴) اور اس میں حضرت الحسین بن منصور حلاج کے احوال کی ابتدا اور انتہا کو بیان کیا ہے (صفحہ ۱۶۰)

۳۔ اسرار الخرق والموئنات : گدڑی پہننے کے آداب و شرائط پر (صفحہ ۵۳)

۴۔ کتاب فنا و بقا : بچپنے اور علمی ناپختگی کے دور میں لکھی گئی۔ (صفحہ ۵۷)

۵۔ حضرت حسین بن منصور حلاج کے کلام کی شرح لکھی لیکن اسکا نام نہیں بتایا۔ (صفحہ ۔ ۱۶۰)

۶۔ کتاب البیان لاہل العیان : جمع و تفرقہ کی بحث میں یہ کتاب ابتدائے حال میں لکھی تھی۔ (صفحہ ۲۸۳)

۷۔ بحر القلوب : اس میں باب جمع میں ایک طویل فصل بیان کی ہے (صفحہ ۲۸۳)

۸۔ الرعایت لحقوق اللہ : اثبات توحید کے بیان میں اور مجوسیوں، طبعیوں —— فلکیوں اور معتزلہ وغیرہ کی تردید میں لکھی گئی (صفحہ ۳۰۵)

۹۔ ایمان کے بیان میں ایک علیحدہ کتاب لکھی ہے مگر اسکا نام نہیں بتایا (صفحہ ۳۱۲)

اِن کتابوں میں ایک مختصر رسالہ "کشف الاسرار" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اسکے کئی تراجم شائع ہو چکے ہیں لیکن داتا صاحبؒ سے اسکی نسبت محقّق نہیں ہے !

② داتا صاحبؒ کی ان کتابوں میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہی یا ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکی۔ داتا صاحبؒ نے "کشف المحجوب" میں مذکورہ فہرست کی پہلی دو کتابوں کے

سرقہ کی اطلاع دی ہے اور باقی کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"میں نے فنِ تصوّف میں کئی کتابیں لکھی تھیں جو سب ضائع
ہوگئی ہیں اور تصوّف کے جھوٹے مدعیوں نے ان میں سے بعض
باتیں لوگوں کو پھانسنے کے لیے چن لیں اور باقی کو دھو کر ضائع کر دیا"[۳۴]

"کشف المحجوب" کے مطالعہ سے مترشح ہے کہ سبھی کتابوں کے ضائع ہو جانے کے بیان میں قدرے مبالغہ پایا جاتا ہے کیونکہ داتا صاحب نے مذکورہ فہرست میں سے دو کتابوں کے محفوظ رہ جانے کی خود اطلاع دی ہے اور پڑھنے والوں کو تفصیلی مطالعہ کے لیے ان سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ :

"گدڑی کے آداب و شرائط کے بارہ میں میری ایک علیحدہ کتاب
'اسرار الخرق والموٴنات' ہے ۔اس کا ایک نسخہ مرید کے پاس
ہونا چاہیئے"[۳۵]

دوسری کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ میں نے توحید کے اثبات میں اور توحید کے منکروں کے رد میں ایک علیحدہ کتاب لکھی ہے جسکا نام 'الرعایت لحقوق اللہ' رکھا ہے متعلم کو یہ مسئلہ میری اس کتاب میں تلاش کرنا چاہیئے یا متقدمین اہل اصول رضی اللہ عنہم کی کتابوں سے رجوع کرنا چاہیئے[۳۶]۔ کشف المحجوب تو کسی زمانے میں بھی شائقین کی نظروں سے اوجھل نہیں رہی مگر قیاس کہتا ہے کہ اگر تلاش کیا جائے تو کیا عجب کہ اور نہیں تو یہ دونوں کتابیں مل جائیں ؟ (۶۷)

باب ۸

سیاحت

****

داتا صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ عالم اسلام کی سیاحت میں گزرا۔ کشف المحجوب میں سفر کو حصولِ مطلب کا ذریعہ قرار دیا ہے[۱]۔ سفر تصوف کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے داتا صاحب نے حضرت جنید رح کے حوالے سے لکھا ہے کہ :

"تصوف آٹھ خصائل پر مشتمل ہے : (۱) سخاوت (۲) رضا
(۳) صبر (۴) اشارہ (۵) غربت (۶) صوف پوشی
(۷) فقر اور (۸) سیاحت"

پھر ان میں سے ہر ایک کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"سیاحت حضرت عیسیٰ ؑ کا اتباع ہے کہ ساری عمر تبلیغ حق کے لئے
سیاحت کرتے رہے"

کوئی دنیادار کسی بھی مقصد کے لئے سیاحت پر روانہ ہو سکتا ہے لیکن صوفی کا معاملہ دوسرا ہے داتا صاحب رح نے وہ مقاصد متعین کر دیئے ہیں جن کے لئے کوئی صوفی سفر اختیار کر سکتا ہے۔ لکھتے ہیں :

"سفر صرف اللہ کے لئے کیا جائے اور اس میں کوئی مادی خواہش شامل نہ ہو۔ ہمیشہ باوضو رہے اور اپنے اوراد و وظائف کو جاری رکھے۔ سفر صرف ان پانچ مقاصد کے لئے اختیار کرے :

(۱) حج (۲) غزوہ (۳) باطنی فوائد کے حصول کیلئے زیارات

(۴) تحصیلِ علم اور (۵) کسی بزرگ سے ملاقات ۔۔۔ ان کے

علاوہ کسی مقصد کے لئے سفر کرنے والا خطاوار ہوگا۔[۲]"

سامانِ سفر

ریلوں۔ موٹروں اور عمدہ سڑکوں پر سفر کے عادی لوگ ان مشکلات کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے جو آج سے ایک ہزار سال پہلے کے مسافروں کو درپیش تھیں۔ آج کی بہ نسبت اس زمانے میں مسافر کو سواری اور زادِ راہ کی ضرورت زیادہ تھی لیکن صوفیوں کو اسکی ممانعت تھی

داتا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ :

" مسافر کے پاس بس اتنا سامان ہونا چاہیئے :

(۱) ستر پوشی کے لئے ایک گدڑی

(۲) نماز ادا کرنے کے لئے ایک مصلّےٰ

(۳) وضو کے لئے لوٹا

(۴) وضو کے بعد پہننے کے لئے کفش اور

(۵) ضرر رساں جانوروں کو ہٹانے کے لئے ایک چھڑی

اگر کوئی شخص سنت کی پیروی کرتے ہوئے اس سے زیادہ سامان رکھے جیسا کہ کنگھی، ناخن تراش، سوئی دھاگہ اور سرمہ وغیرہ تو یہ بھی جائز ہے۔ لیکن اس سے زیادہ سامان اور ذاتی زیب و زینت ممنوع ہے۔ اگر مسافر ارادت کے مقام میں ہے تو اس سے زیادہ سامانِ سفر قید، بت، دیوار اور حجاب ہوگا اور اسکے نفس کی سرکشی اور رعونت کا اظہار کرے گا ۔۔۔ ہاں البتہ اگر مسافر تمکین و استقامت کے مقام میں ہے تو مذکورہ سامان سے زیادہ بھی رکھا جا

سکتا ہے"۳

ایک مصلّے ایک چھڑی

ہمارے داتا صاحبؒ کے صاحب تمکین ہونے میں کوئی کلام نہیں تاہم آپ جس بے سروسامانی کے ساتھ لاہور تشریف لائے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے خود بھی لوٹے، مصلّے، نعلین اور ایک چھڑی کے سہارے مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحل سے لے کر مشرق میں گنگ وجمن کے کناروں تک — شمال میں ایک طرف بحیرہ خزر (کیسپین) اور دوسری طرف تاشقند سے لیکر خلیج فارس کے ساحل تک سفر کیا۔ داتا صاحب کے سفر کا نقشہ کھینچنا محال ہے تاہم خود کشف المحجوب میں کہیں واضح طور پر اور کہیں اشارۃً جن شہروں کی سیاحت کا ذکر کیا ہے۔ ان میں دمشق۔ رملہ۔ بیت الجن۔ آذربائیجان۔ سمرقند کے مشرق میں جبل بتم۔ بغداد۔ خوزستان۔ فارس۔ طوس۔ نیشاپور۔ میہنہ۔ بسطام۔ سرخس مرو۔ بخارا اور اذکند شامل ہیں۔

سیاسی حالت

داتا صاحبؒ کی زندگی کے اوائل دنوں میں پنجاب سے لیکر مغربی ایران تک کا علاقہ غزنویوں کے قلمرو میں شامل تھا لیکن آخری دَور میں افغانستان کے کچھ حصے، ماوراء النہر اور خراسان کے علاقے ان کے ہاتھوں سے نکل کر سلجوقیوں کے پاس چلے گئے — زیریں ایران میں بویہ خاندان حکمران تھا، کچھ علاقوں میں دیلمی راج کر رہے تھے۔ شام، اردن، لبنان اور فلسطین کے علاقے مصر کے فاطمی خلفاء کے زیرنگیں تھے۔ ان میں سے بعض حکمران غیر مسلم علاقوں میں جہاد کرتے دکھائی دیتے ہیں — تاہم اس سے جو وقت بچتا وہ سبھی حکمران آپس میں لڑنے بھڑنے میں مصروف رہتے تھے۔ مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں نے سیاسی انتشار پھیلا دیا تھا۔

فکری انتشار

داتا صاحبؒ کے زمانہ میں مسلمانوں کا فکری انتشار بھی انتہا کو پہنچ گیا تھا مشہور سیاح ابو عبداللہ محمد المقدسی البشاری نے ۳۷۵ھ / ۹۸۵ء میں اپنا سفر نامہ "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" شائع کیا۔ اس نے صرف جغرافیائی حالات قلمبند نہیں کیے بلکہ عوام کے عقائد اور معاشرتی حالات پر تبصرہ کر کے اپنی تصنیف کو لاجواب بنا دیا ہے۔[۲]

مقدسی نے عالم اسلام کے مختلف علاقوں میں فکری انتشار اور فرقہ پرستی کی جو تصویر کھینچی ہے، اُسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ داتا صاحبؒ نے بھی کشف المحجوب میں جگہ جگہ اپنے زمانے کی خرابی کا جو گلہ کیا ہے۔ اس کی وجہ پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے — اب ہم کشف المحجوب کے ذریعے داتا صاحب کی سیاحت کو بیان کرتے ہیں۔ معاشرتی پس منظر کی وضاحت کے لئے مقدسی کا بیان نقل کر دیا جائیگا۔

طوس

داتا صاحب نے طوس میں حضرت ابوالقاسم گرگانیؒ سے ملاقات کا ذکر کئی جگہ کیا ہے۔ مثلاً گدڑی کے باب میں لکھتے ہیں :

> "میں نے کہ علی بن عثمان جلابی ہوں، طوس میں شیخ المشائخ ابوالقاسم گرگانیؒ سے دریافت کیا کہ درویش کو کم سے کم کن چیزوں کا علم ہونا چاہیئے؟ انھوں نے فرمایا: تین چیزوں کا: (۱) چیتھڑا سیدھا سینا جانتا ہو (۲) سچی بات سننا جانتا ہو اور (۳) پاؤں کو زمین پر صحیح رکھنا جانتا ہو۔"

پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گدڑی حقیقی فقر کے لئے ہو زیب و زینت کے لئے نہ ہو۔ بات کو حال کے ساتھ سنیں نہ کہ قال کے ساتھ۔ زمین پر صحیح طرح پاؤں رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری رواج اور لہو کے لئے نہیں، بلکہ جذبہ محبت الٰہی میں زمین پر پاؤں رکھا جائے۔"

شیخ ابو القاسم نے یہ تشریح سنی تو فرمایا: "علی نے سچ کہا ہے اللہ اسے نیکی دے۔"[۵]

مقدسی بتاتا ہے کہ طوس کے سارے باشندے امام شافعی کے مقلد ہیں اور وہاں ان کی فقہ پر عمل ہوتا ہے۔[۶]

سرخس

حضرت داتا صاحبؒ نے سرخس میں خواجہ امام خزاعیؒ سے اپنی ملاقات کا حال ص۲۴۴ پر لکھا ہے۔ مقدسی ہمیں بتاتا ہے کہ سرخس میں حنفیوں کے فرقہ عروسیہ اور شافعیوں کے فرقہ اہلیہ کے درمیان سخت عداوت پائی جاتی ہے۔[۷]

نسا۔مرو

داتا صاحبؒ نے فرقہ سیاریہ کے ضمن میں نسا اور مرو کی سیاحت کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان شہروں میں حضرت ابو العباس سیاریؒ کے پیرو کار موجود ہیں اور یہ کہ انہوں نے مرو میں حضرت سیاری کے رسالے اور خطوط کا مطالعہ کیا ہے۔[۸]

مقدسی نے لکھا ہے کہ نسا خوبصورت درختوں میں چھپا ہوا صاف ستھرا شہر ہے۔ جامع مسجد خوش نما ہے۔ شہر مذہبی عیاروں کا اکھاڑہ ہے۔ مذہبی تعصب نے اجتماعی عافیت برباد کر دی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ نسا کے عالموں نے قرآن تک میں اضافہ کر دیا

ہے۔ اذان ترجیع سے دی جاتی ہے یعنی شہادت کے دونوں کلموں کو پہلے دو دو بار ہلکی آواز سے اور پھر دو دو بار بلند آواز سے ادا کیا جاتا ہے۔ بہت سے معاملات میں اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں ہوتا۔[9]

مرو کے بارے میں لکھا ہے:

"شہر کے وسط میں جامع مسجد ہے۔ شہر میں بیدار مغز اور باشعور اکابر موجود ہیں۔ ہر رات وعظ اور مباحثے ہوتے ہیں۔ واعظ فقہ کا علم رکھتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں۔ مدارس میں طلباء کو وظائف دیئے جاتے ہیں۔ لوگوں میں فیاضی اور مروت کی کمی ہے؛ وسائل رزق تنگ ہیں۔ باشندے شاطر اور فتنہ پرور ہیں ــــ فسادات کی وجہ سے شہر کی آبادی کم ہو گئی ہے اور اکثر مکان اجڑ گئے ہیں۔ شہر میں بدکاریاں پھیلی ہیں اور برابر جھگڑے فتنے ہوتے رہتے ہیں۔ باشندے طعن اور طنز اور احمقانہ حرکتوں کے خوگر ہیں۔"[10]

داتا صاحبؒ نے لکھا ہے:

"ایک دفعہ میں مرو میں تھا کہ ائمہ اہلحدیث میں سے ایک نے جو سب سے زیادہ مشہور تھے مجھ سے کہا: کہ انہوں نے سماع کی اباحت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ دین میں ایک بڑی مصیبت پیدا ہو گئی کہ حضرت امام نے ایک لہو کو جو تمام بدکاریوں کی اصل ہے حلال کر دیا ہے۔"[11]

نیشاپور

کشف المحجوب میں نیشاپور کی سیاحت کا ذکر واضح طور پر نہیں کیا گیا۔ تاہم نیشاپور

کے کئی بزرگوں اور واقعات کا ذکر آیا ہے۔ ان میں داتا صاحب کے معاصر جنہیں بڑے ادب سے استاد ابوالقاسم قشیریؒ لکھتے ہیں ــــ نیشاپور میں ہی آرام فرما ہیں نیز نیشاپور خراسان کا صدر مقام تھا لہذا داتا صاحب نے وہاں کی سیاحت ضرور کی ہوگی۔ مقدسی اسے عالم اسلام کا لاثانی شہر قرار دیتا ہے مگر افسوس کرتا ہے کہ یہاں کے بلووں اور جھگڑوں کو دیکھ کر عقل چرخ ہوتی ہے اور مذہبی تعصبات کا مشاہدہ کر کے دل ٹکڑے ہوتا ہے۔ شیعوں اور کرامیوں کا طوطی بولتا ہے۔ عوام انہی دو فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ فقہا کی مٹی پلید ہے۔ عوام کا حال یہ ہے کہ جہاں کسی سرپھرے نے کوئی نعرہ لگایا اس کے پیچھے ہو لئے ــــ مذہبی تعصب کا زہر بری طرح پھیلا ہوا ہے[۱۲]

یہ سب شہر خراسان کے ہیں اور خراسان داتا صاحب کے زمانہ میں صوفی تحریک کا بہت بڑا مرکز تھا۔ داتا صاحب نے 'کشف المحجوب' میں خراسان کے متاخرین صوفیا کا مختصر حال لکھا ہے، اس فصل کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے کہ :

"اہلِ خراسان کہ آجکل وہاں اقبال حق کا سایہ ہے۔"

فصل کے آخر میں لکھتے ہیں :

"اگر میں اہلِ خراسان میں سے سب بزرگوں کو شمار کروں تو کتاب طویل ہو جائے گی۔ میں نے تین سو صوفی صرف خراسان میں دیکھے ہیں اور یہ ایسے تھے کہ ان میں سے ایک ایک ساری دنیا کے لئے کافی تھا۔ وجہ یہ ہے کہ خراسان کے آسمان پر آفتاب محبت اور اقبالِ طریقت جلوہ دکھا رہا ہے[۱۳]"

مقدسی کے زمانہ سیاحت میں خراسان پر آلِ سامان کی حکومت تھی۔ وہ لکھتا ہے

سامانی سلاطین اپنے دربار میں علماء کو زمین بوسی پر مجبور نہیں کرتے جمعہ کی رات کو ان کے دربار میں مناظرہ اور مباحثہ کی مجلسیں ہوتی ہیں

جن میں بڑے بڑے فاضل شریک ہوتے ہیں ۔ سلاطین کا رجحان فقہ حنفی کی طرف ہے، ان کا وزیر بخارا کا سب سے ممتاز فقیہہ اور راست باز شخص ہوتا ہے[۱۴] ۔ مقدسی لکھتا ہے کہ خراسان کی مجموعی زندگی راہ راست پر ہے مگر بعض شہروں سجستان۔ ہراۃ کے مضافات یعنی استربیاں اور کرشخ میں خارجیوں کی بڑی تعداد آباد ہے ۔ نیشاپور میں معتزلہ نمایاں ہیں، شیعوں اور کرامیوں میں بحث ومناظرے ہوتے رہتے ہیں[۱۵] ۔

ماوراءالنہر

دریائے جیحوں کے اوپر والے پورے علاقہ کو ماوراءالنہر کہتے ہیں لیکن مقدسی اسے ہیطل لکھتا ہے ۔ کشف المحجوب میں داتا صاحب نے ماوراءالنہر میں اپنی سیاحت کا ذکر کئی جگہوں پر کیا ہے ۔ مثلاً صفحہ ۴۸ پر لکھا ہے کہ :

" ماوراءالنہر میں ایک بوڑھے کو دیکھا جو عام لوگوں کے استعمال کے لائق چیزیں استعمال نہیں کرتا تھا "

پھر صفحات $\frac{۲۵۶}{۲۵۷}$ پر باب عمر کی ملاقات کے لئے اذکند سے سلاتک تک جانے کا قصہ بیان کیا ہے ۔ پھر صفحہ ۳۹۸ پر بخارا میں ایک ایسے بزرگ کو دیکھنے کا بتایا ہے ۔ جو چالیس سال سے رات کو نہیں سوتے تھے ۔ نیز متاخرین صوفیا کے ذیل میں ماوراءالنہر کے کچھ ایسے بزرگوں کا حال لکھا ہے جن سے ملاقات رہی تھی ۔ " ان کو دیکھا اور ہر ایک کے حال کو معلوم کیا[۱۶] "

مقدسی لکھتا ہے کہ ماوراءالنہر ہمہ صفت صوبہ ہے ۔ ہر ملک سے زیادہ سرسبز و شاداب ہے ۔ کسی ملک میں نہ تو اتنے فقیہہ ہیں نہ علم کا ایسا چرچا ہے نہ مذہبی زندگی ایسی صراط مستقیم پر ہے ۔ ادب اور حدیث سے لوگوں کو خاص شغف ہے ۔ درس و تدریس کا سلسلہ دن رات جاری رہتا ہے ۔ ماوراءالنہر کے شہر تاشقند کے بارے میں لکھتا ہے :

کہ یہاں خوبیوں اور خرابیوں کا پلہ برابر ہے ۔۔۔ ایک طرف ارزانی ہے تو دوسری طرف جھگڑے خوب ہوتے ہیں ۔۔۔ باشندے سُنی ہیں لیکن متعصب ۔ سمرقند میں علم کا بڑا چرچا ہے ۔ اور جید عالم فاضل موجود ہیں ۔

بخارا کے بارے میں لکھتا ہے کہ ساری مسجدیں خوشنما ہیں اور نمازیوں سے بھری رہتی ہیں ۔ جہلا اور اَن پڑھوں کی تعداد کم ہے ۔۔۔ واعظ، فقیہہ اور تفسیر کا علم رکھتے ہیں ۔ یہاں باہر کے بہت سے لوگ آ گئے ہیں جنھوں نے برائیاں پھیلانا شروع کر دی ہیں ۔ یہ لوگ بدمعاملہ ہیں اور نماز با جماعت کو غیر ضروری سمجھتے ہیں ۔ درباری مقربوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو ریشم اور دیباج پہنتا ہے ۔ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا ہے اور مذہبی معاملات سے بے اعتنائی برتتا ہے ۔۔۔ پھر لکھتا ہے کہ : فرغانہ ۔ سمرقند اور ختل میں کرامیہ فرقہ کی خانقاہیں ہیں ۔ دیہاتوں میں ایک فرقہ ہے جسکو "سفید پوش" کہتے ہیں ۔۔۔ اس کا مذہب زندقہ سے مشابہ ہے ۔ ترمذ کے اکثر باشندے جہمی ہیں ۔[۱۸]

آذربائیجان

داتا صاحب نے کشف المحجوب میں آذربائیجان کی سیاحت کا بھی ذکر کیا ہے ۔۔۔ ایک بار اپنے شیخ کے ساتھ آذربائیجان میں جا رہے تھے کہ چند گدڑی پوشوں کو ایک زمیندار کے آگے جھولی پھیلائے دیکھا تو شیخ سے پوچھا کہ یہ لوگ کس وجہ سے اس بلا میں مبتلا اور مخلوق کے سامنے رسوا ہوئے ہ تو شیخ نے فرمایا کہ ان کے پیروں کو مرید جمع کرنے کی حرص تھی اور انہیں دنیا جمع کرنے کی ۔[۱۹] ۔۔۔ پھر آذربائیجان کے پہاڑوں میں ایک درویش کا چشم دید واقعہ لکھا ہے کہ وہ اشعار پڑھتا اور گریہ زاری کرتا جا رہا تھا ۔۔۔ آخر ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور جان اللہ کے سپرد کر دی ۔[۲۰] داتا صاحب نے متاخرین صوفیا

کے ذیل میں قہستان۔ آذربائیجان اور طبرستان کے مشترکہ عنوان سے نو بزرگوں کا ذکر کیا ہے[21]

مقدسی ہمیں بتاتا ہے کہ قہستان کے باشندے حنفی ہیں ــ بحیثیت مجموعی امام شافعی کا مسلک غالب ہے۔ شیعوں کی بڑی تعداد آباد ہے[22]۔ آذربائیجان کے بارے میں لکھتا ہے۔ کہ اس کا صدر مقام اردبیل ہے ــ شہر میں ہر وقت فوج رہتی ہے۔ باشندے بخیل، اور بارخاطر ہیں۔ عالموں کا فقدان ہے، واعظ فقہ سے ناآشنا ہیں اور لوگ مذہبی تعصب میں گرفتار ہیں۔ شیعہ نہیں پائے جاتے۔ علم کلام سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ تصوف کی طرف میلان زیادہ ہے۔ دبیل میں ایک خانقاہ بھی ہے[23] ـــ طبرستان کے بارے میں لکھا ہے کہ آمل اس کا صدر مقام ہے کچھ باشندے حنفی ہیں باقی یا تو حنبلی ہیں یا شافعی پہاڑی علاقہ میں کرامیہ فرقہ کی خانقاہیں ہیں۔ بعض حصوں میں شیعوں کا زور ہے[24]۔

خوزستان

داتا صاحبؒ نے حضرت حسین بن منصور الحلاجؒ کے سوانحی خاکہ میں خوزستان کی سیاحت کا اشارۃً ذکر کیا ہے کہ آپ نے الحلاج کی تصنیفات کے بعض نسخے خوزستان میں دیکھے ہیں[25]

مقدسی نے خوزستان کو عقائد کا اکھاڑہ بتایا ہے۔ لکھتا ہے: واعظ قصہ گو ہیں، اور مسجدوں میں اودھم مچائے رکھتے ہیں۔ صدر مقام اہواز کو چھوڑ کر ہر شہر میں زاہد و عابد پائے جاتے ہیں عسکر مکرم کو چھوڑ کر ہر جگہ صوفی اور خانقاہیں موجود ہیں۔ صوفیوں کا ایک فرقہ حُبیہ ہے جو ناچ گانے کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ ان کے بہت سے رواج غیر اسلامی ہیں اور اخلاق ناپسندیدہ۔

اہواز کے بارے میں لکھتا ہے کہ شہریوں میں نہ شرافت نسبی ہے نہ دین ایمان۔ جامع مسجد عیاروں اور قلندروں کا اڈا ہے۔ خوزستان کے ایک اور شہر سُوس کے بارے میں

لکھتا ہے: لوگ اہل سنت والجماعت ہیں۔ جامع مسجد عمدہ ہے۔ مگر اس کے دروازوں کے پاس چھلکے کھلے ہوتے ہیں۔ عسکر مکرم کے علماء کو علم الکلام اور اعتزال سے شغف ہے۔ اس لئے عوام ان سے نفرت کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر مذہبی حالت یہ ہے۔ خوزستان اعتزال کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ کسی دوسرے ملک میں یہاں سے زیادہ معتزلی نہیں پائے جاتے، عسکر مکرم والے تو سو فیصد معتزلی ہیں۔ اہواز کے نصف باشندے شیعہ ہیں جو سُنی فرقہ فضلی کے ساتھ برسرِ پیکار رہتے ہیں ـــــ اسی طرح عسکر مکرم اور تستر کے مابین بھی تعصب کی وجہ سے لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تستر والوں نے ایک مرتبہ سوس سے حضرت دانیال کا تابوت منگوایا اور پھر واپس نہ کیا۔ اس سے دونوں شہروں کے درمیان تعلقات خراب ہو گئے۔ [۲۶]

فارس

داتا صاحب نے فارس میں حضرت الحلاج کی بعض تصانیف دیکھنے کی اطلاع دی ہے۔ (ص ۱۵۹) اور پھر متاخرین صوفیاء کے باب میں فارس کے چھ بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔ [۲۷]

مقدسی نے بتایا ہے کہ فارس کی حکومت کا مستقر شیراز ہے جو نو وجود شہر ہے۔ عالم ادب و ظرافت سے خالی ہیں۔ ثقہ اور عادل لوگ قوم لوط سے ہیں ـــ تاجر زانی ہیں۔ میں نے علماء کا لباس پہننے والوں کو شراب کے نشہ میں دھت دیکھا ہے۔ قبرستان اور مقبرے بدمعاشوں کے اڈے ہیں۔ یہاں کی جامع مسجد بے نظیر ہے جس میں درسی حلقوں کے علاوہ صوفیوں کی محفلیں گرم رہتی ہیں۔ مجموعی طور پر فارس میں متعدد مسلک و مذہب موجود ہیں مثلاً حنفی۔ شافعی۔ معتزلی۔ حنبلی اور شیعی یہاں داؤدی ہر جگہ سے زیادہ ہیں، اور بڑے بارسوخ و مقتدر ہیں۔ احناف کی تعداد بھی کافی ہے لیکن غلبہ اہل حدیث کا ہے۔ ارجان اور ساحلی مقامات پر شیعوں کی تعداد زیادہ ہے۔ معاشرہ میں واعظوں کو عزت حاصل نہیں۔ [۲۸]

کرمان

داتا صاحب نے متاخرین صوفیاء کے باب میں کرمان کے بزرگوں پر ایک فصل قائم کی ہے جس میں تین کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جوانوں اور نوخیزوں میں بھی کے امیدوار ہیں[۲۹]

مقدسی نے لکھا ہے کہ کرمان کی کھجور اتنی میٹھی ہوتی ہے کہ سادہ کھائی نہیں جاتی۔ اس کا صدر مقام سیرجان ہے۔ علماء معتزلی خیالات کے ہیں۔ نرماسیر کھجور کی تجارت کا مرکز ہے۔ یہاں کی عورتیں بدچلن ہیں۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ اونٹ کھجور اٹھانے کرمان آتے ہیں تو زنا اور فساد کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ جیرفت کے ضلع کے باشندے حنفی ہیں۔ باقی مملکت میں بحیثیت مجموعی امام شافعی کا مسلک غالب ہے۔ فقہ کے ماہر کم ہیں۔ اہلحدیث کا اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ بم میں خوارج ہنگامے مچاتے ہیں۔ ان کی جامع مسجد الگ ہے۔ سیرجان میں معتزلی بہت ہیں۔ ضلع جیرفت کے علاقوں رودکان۔ قوہستان۔ منوقان اور بلوچ علاقہ کے اکثر باشندے شیعہ ہیں[۳۰]

شام

داتا صاحبؒ کے مرشد حضرت ابوالفضل محمد بن الحسین الختلیؒ کا قیام زیادہ تر جبل لکام میں رہا۔ جبل لکام سلسلہ کوہ لبنان کا وہ حصہ ہے جو انطاکیہ اور مصیصہ کے متصل ہے[۳۱]۔ داتا صاحب نے صفحہ ۱۷۳ پر ان کا سوانحی خاکہ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ وفات کے وقت بیت الجن میں تھے جو بانیاں اور دمشق کے درمیان ہے رحلت کے وقت ان کا سر داتا صاحب کی گود میں تھا۔

اسی طرح ص ۴۲۵ پر اپنے مرشد کے ساتھ بیت الجن سے دمشق جانے کا ایک

واقعہ لکھا ہے ــــ اس کے بعد صفحہ ۳۸۴ پر حسین بن منصور الحلاج کی مناجات کی تلاش میں دو درویشوں کے ساتھ دمشق سے رملہ جانے کا ایک واقعہ لکھا ہے، اور صفحہ ۱۰۱ پر حضرت بلال رضؓ مؤذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار پر سونے کے دوران اپنا ایک خواب لکھا ہے جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔

مقدسی لکھتا ہے کہ شام کے صدر مقام دمشق کے باشندے مفسد اور شوریدہ سر ہیں ــــ اس کی واحد خوبی اور قیمتی سرمایہ ولید بن عبدالملک کی تعمیر کردہ جامع مسجد ہے۔ رملہ ضلع فلسطین کا صدر مقام ہے ــــ کنوؤں کا پانی کھاری ہے لہذا بارش کا پانی حوضوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ جن میں قفل ڈال دیئے جاتے ہیں۔ نادار پیاسا رہتا ہے اور پردیسی حیران و پریشان!

مقدسی کا اپنا شہر بیت المقدس مرجع خلائق تھا ــــ مگر وہ اپنے آبائی شہر کی فکری اور دینی حالت کا نقشہ کھینچنے میں ذرا بھی جانبدار نہیں لکھتا ہے:

"مظلوموں کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ نادار پریشان رہتے ہیں۔ فقہا کے پاس کوئی پھٹکتا نہیں۔ ادیبوں کو کوئی پوچھتا نہیں۔ انصاف کی عدالتیں ہیں نہ تدریس کے حلقے۔ مسجدوں میں بھی زیادہ مجمع نہیں ہوتا ــــ شام پر مصر کے فاطمی خلفاء حکمران ہیں۔ بیت المقدس میں حنفیوں کا ایک حلقہ ہے جہاں وعظ ہوتا ہے۔ کرامیہ فرقہ کے علماء خانقاہوں میں وعظ دیتے ہیں۔ طبریہ کے سارے نابلس اور قدس کے آدھے باشندے شیعہ ہیں۔ معتزلہ کے لئے ماحول سازگار نہیں اسلئے دبے ہوئے ہیں۔ مالکی اور داؤدی فقہ کے پیرو بھی یہاں نہیں پائے

جاتے۔ جامع مسجد میں محدث اوزاعی (متوفی ۱۵۷ھ/۳-۷۷۴ء) کی فقہ کا ایک درسی حلقہ ہے۔ شام پر فاطمیوں کے قبضے سے پہلے اہل حدیث کے مسلک پر عمل ہوتا تھا اور فقیہہ شافعی مذہب کے پیرو ہوا کرتے تھے۔ کوئی قصبہ یا شہر ایسا نہ تھا جہاں حنفی نہ پائے جاتے ہوں۔ کبھی کبھی ان کے جج بھی مقرر ہوتے تھے لیکن آج فاطمی قانون و شریعت پر عمل ہوتا ہے۔"[۳۲]

عراق

داتا صاحبؒ نے اپنی عمر کا کچھ حصہ امام ابوحنیفہؒ اور حضرت جنیدؒ کے شہر بغداد میں گزارا تھا۔ مختلف شیوخ کے بیان میں بغداد، اسکے گلی محلوں اور مسجدوں کا اسطرح ذکر کرتے ہیں جیسے شہر کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ حسین بن منصور الحلاج کے سوانحی خاکہ میں، بغداد میں اپنی علمی سرگرمیوں پر یہ کہہ کر روشنی ڈالتے ہیں کہ :

"میں نے ان کی پچاس تصانیف تو صرف بغداد اور اس کے نواح ہی میں دیکھی ہیں۔"[۳۳]

اور پھر اسی باب میں لکھتے ہیں کہ :

"میں نے بغداد اور اس کے نواح میں ملحدوں کے ایک گروہ کو دیکھا ہے کہ الحلاج کے کلام کو اپنے زندقہ کی حجت قرار دیتا ہے اور اپنا نام حلاجی رکھتا ہے اور ان کے معاملہ میں اسی طرح مبالغہ کرتا ہے جس طرح کہ رافضی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں غلو کیا کرتے ہیں۔"[۳۴]

اس کے بعد فرقہ حلولیہ کے بیان میں لکھتے ہیں کہ :

"میں نے ابو جعفر صیدلانی اور چار ہزار آدمیوں کو دیکھا ہے۔ جو
عراق میں پھیلے ہوئے تھے اور سب کے سب حلاجی تھے[۳۵]"

اس کے بعد اقامت میں صحبت کے آداب میں اپنا ایک واقعہ لکھا ہے ۔۔۔ کہ
دیارِ عراق میں قیام کے دوران طلب دنیا اور اسے بے دریغی سے خرچ کرنے میں
مصروف تھے، یہاں تک کہ بہت زیر بار ہو گئے ۔۔۔ جس کسی کو حاجت ہوتی، وہ
آپ کے پاس پہنچ جاتا۔ یہ دیکھ کر ساداتِ وقت میں سے ایک نے لکھا کہ اے بیٹے
خبردار! اپنے دل کو خدا کی یاد سے ہٹا کر خواہش نفس کے مارے ہوئے لوگوں میں نہ
لگا ۔۔۔ اس کام سے ہاتھ اٹھا لے کیونکہ خود خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے کافی ہے[۳۶]

پھر سوال اور ترک سوال کے باب میں کوفہ کا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا ہے
کہ ایک باحشمت صوفی کو دیکھا جو بھوک کے مارے صحرا سے نکل کر بازار میں آئے
ایک ہاتھ پر ایک چڑیا بٹھا رکھی تھی اور کہہ رہے تھے کہ کون ہے جو مجھے اس چڑیا کے
واسطے کچھ دے ۔۔۔ لوگوں نے اعتراض کیا تو کہا: میرے لئے خدا کے واسطے سے دُنیا
مانگنا جائز نہیں۔[۳۷]"

مقدسی نے عراق کے مفاخر بیان کرنے کے بعد دارالخلافہ بغداد کے بارے میں لکھا
ہے کہ کسی زمانے میں بے حد بارونق شہر تھا۔ لیکن جب عباسی خلفاء کمزور ہوتے تو اسکا
زوال شروع ہو گیا ۔۔۔ آبادی کم ہو گئی، شہر تقریباً اجڑ چکا ہے۔ جامع مسجد میں صرف جمعہ
کے دن آبادی ہوتی ہے۔ شہر کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ
سامرا کی طرح برباد ہو جائے گا۔ فتنے فساد، جہالت اور فسق و فجور کا بازار گرم ہے۔ مقامی
حکومت ظالم ہے۔

کوفہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ شہر عظمت اور مدنیت میں بغداد
کا ہم پلہ تھا مگر اب حالت خراب ہے۔ بیرونی حصے اجڑ گئے ہیں۔ بصرہ کی مسجد شاندار

اور آباد ہے۔ بہت سے صالح لوگ رہتے ہیں مگر عجیب عجیب فتنے اٹھتے رہتے ہیں۔ عراق پر عباسی خلفا کی حکومت ہے جو سلاطین بویہ کے ماتحت ہیں (یہ ماتحتی ۳۳۴ھ / ۱۰۵۵ء تک رہی)۔

بغداد میں عراق کے بلند پایہ فقہا حنابلہ اور شیعہ عوام پر حاوی ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں مالکیہ۔ اشعریہ، معتزلہ اور نجاریہ فرقوں کے پیرو بھی موجود ہیں۔ بصرہ میں کافی لوگ سالمیہ فرقے کے پیرو ہیں۔ کناسہ محلہ کو چھوڑ کر جو سُنی ہے، کوفے کے باقی سب لوگ شیعہ ہیں۔

بصرہ کے بیشتر لوگ قدریہ ہیں ۔۔۔ لیکن یہاں حنبلی بھی پائے جاتے ہیں۔ بغداد کے حنبلی بڑے غالی ہیں اور تشبیہہ کے قائل۔ حنابلہ کی بربہاری شاخ کو خاص طور پر امیر معاویہؓ سے بے پایاں محبت ہے۔ عراق کے اکثر فقیہہ اور جج حنفی مسلک کے ہیں ۔۔۔ بصرہ میں قبیلہ ربیعہ کے شیعی عرب اور قبیلہ سعد کے سُنی عرب بڑے متعصب ہیں بصرہ کے دیہات میں بھی شیعہ سُنی تعصب کا اثر پہنچ گیا ہے[۳۸]۔

ترکستان

داتا صاحب سماع سے متعلقہ امور پر بحث کرتے ہوئے عادت اور طبیعت کے بیان میں اپنی سیاحت ترکستان کا سراغ ایک چشم دید واقعہ سے دے گئے ہیں:

> "میں نے ترکستان میں اسلام کی سرحد پر ایک شہر میں دیکھا کہ
> ایک پہاڑ میں آگ لگ گئی تھی اور وہ جل رہا تھا۔ اس کے پتھروں
> سے نوشادر ابل رہا تھا۔ اس آگ میں ایک چوہا تھا جب وہ
> اس آگ سے باہر نکلا تو ہلاک ہو گیا[۳۹]۔"

یہ پہاڑ ممکن ہے کوئی آتش فشاں ہو اور چوہا وہ جانور ہو جسے فارسی میں سمندر کہتے

ہیں[۳۳] ـــ داتا صاحب کی مراد غالباً روسی ترکستان سے ہے۔ مقدسی کے بقول اس سرحد پر آخری بڑا شہر اسبیجاب تھا جو سمرقند سے چھ مرحلے اور دو برید کے فاصلے پر شمال مشرق میں آباد تھا۔ یہاں دو ہزار سات سو سرحدی چوکیاں ہیں۔ شہر میں قراتگین کی قبر ہے یہ ایک اہم سرحدی شہر اور مستقر جہاد ہے ـــ جہاں لوگ ہر وقت ترکستانی چھاپہ ماروں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے لوگوں سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جاتا ـــ

یاقوت (متوفی ۶۲۶ھ/۱۲۲۹ء) نے معجم البلدان میں یہ اضافہ کیا ہے۔ اسفیجاب حدود ترکستان میں واقع تھا۔ ماوراء النہر اور خراسان میں یہ واحد شہر تھا جسکے باشندوں سے خراج نہیں لیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ اس رقم سے ہتھیار خرید سکیں اور وہاں رہنے میں تکلیف محسوس نہ کریں۔ خوارزم شاہ محمد بن تکش بن الپ ارسلان نے اسے تباہ کر دیا ـــ رہی سہی کسر ۶۱۶ھ/۱۲۱۹ء میں چنگیزی یورش نے پوری کر دی[۳۴]

باب ۹

معاصرین

****

داتا صاحب کے یہاں صوفی وہ ہے جو کامل مسلمان ہو۔ مسلمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کو مسلمانی کا مکمل ترین نمونہ مانتے ہیں۔ اسی لئے داتا صاحب نے "کشف المحجوب" میں تصوف کے ابتدائی امور واضح کرنے کے بعد صوفیوں کی عملی مثالیں پیش کرنے کے لئے کلام کا آغاز خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے کیا ہے:

"اب ہم صحابہ رضی اللہ عنہم — سابقین اولین مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم میں سے ان اماموں کے بعض حالات بیان کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے بعد معاملات میں اہلِ تصوف کے پیش رَو اور انفاس میں ان کے پیشوا اور احوال میں ان کے رہنما ہوتے ہیں۔"

اس باب کا آغاز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے "تصوف کے بارے میں حالات" سے ہوا ہے۔ آپ کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے ... "طریقت میں نہایت لطیف اقوال اور باریک رموز بیان کئے ہیں — پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے صوفیانہ احوال میں بتایا ہے کہ:

"صوفیا اپنے مال و جان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے، اپنے تمام امور کو خدا کے سپرد کرنے اور عبادت میں اخلاص کے اندر آپ ہی

کی اقتدار کرتے ہیں"

آپ کے بعد" حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے بھائی ، دریائے بلا کے غریق - آتش ولایت کے حریق اور تمام اولیاء اور برگزیدگان الٰہی کے پیشوا ابوالحسن علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ" کے صوفیانہ حالات قلمبند کئے ہیں — ان کے بعد اہل بیت میں سے تصوف کے اماموں کا ذکر کیا ہے ، ان کے بعد حضرات اہل صفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہم اور پھر درجہ بدرجہ تبع تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں سے صوفیا کے اماموں کا بیان کرنے کے بعد اپنے زمانہ میں صوفیا کے اماموں کا تذکرہ کیا ہے اور اس موضوع کا اختتام اپنے ایسے معاصرین کے ذکر سے کیا ہے جو آنے والے زمانہ کے صوفیوں کے امام ہوئے ۔

داتا صاحبؒ نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے لے کر تبع تابعین رحمہ اللہ تک کے صوفیانہ افکار و اعمال پیش کر کے مکمل صوفی کا جو نمونہ پیش کیا تھا — اسکی تقلید رسمی صوفیوں کے بس کی بات نہ تھی - داتا صاحب ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :— "جب یہ پہلے بزرگوں کی باتیں سنتے اور ان کی عظمت کو دیکھتے ہیں اور اپنے اندر نگاہ ڈال کر ان اوصاف کا فقدان پاتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں کہ ان کی طرح ہم نہ بن سکتے ہیں اور نہ ہی اس زمانے میں ایسے لوگ موجود ہیں"

داتا صاحب فرماتے ہیں :-

"ان کا یہ قول غلط ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ زمین کو بے حجت کبھی نہیں چھوڑتا — ہر زمانے میں خدا کے نیک بندے موجود رہتے ہیں"

اس کے ثبوت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کی ہے کہ قیامت تک امت مسلمہ میں ایک گروہ ہمیشہ نیکی اور حق پر قائم رہے گا - اس وضاحت کے بعد داتا صاحب نے "ائمہ صوفیائے متاخرین" میں سے دس بزرگوں کی تصویر کشی کی

کی ہے اور یہ امر واضح کر دیا ہے کہ :

"ان بزرگوں میں سے ایک گروہ گزر چکا ہے اور اپنی رُوح کو راحت اور آرام پہنچا چکا ہے۔ دوسرا گروہ ان میں سے ابھی تک زندہ ہے۔ اللہ تعالےٰ ان سے اور سب مسلمان مردوں اور عورتوں سے راضی ہو۔"[۴]

داتا صاحبؒ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دس میں سے پانچ بزرگوں سے براہِ راست اکتساب کیا ہے۔ ان میں سے پہلے بزرگ حضرت ابوالعباس احمد بن محمد القصابؒ ہیں جنھوں نے ماوراءالنہر کے متقدمین صوفیا کو دیکھا تھا۔[۳] دوسرے بزرگ حضرت ابو علی بن حسین بن محمد الدقاق ہیں۔ دقاق کے معنی آٹا فروش کے ہیں۔ سالِ وفات ۴۰۵ یا ۴۰۶ھ / ۱۵-۱۰۱۴ء ہے۔ مہینہ ذی قعد تھا[۴] ــــ تیسرے بزرگ حضرت ابوالحسن علی بن احمد الخرقانیؒ ہیں۔ ۴۱۵ھ/ ۲۵-۱۰۲۴ء میں جب محمود غزنوی کو سومناتھ کے معرکہ میں شکست کا خطرہ لاحق ہوا تھا تو انہی کی گدڑی کو ہاتھ میں لے کر فتح کی دعا مانگی تھی اور خواب میں ڈانٹ سنی تھی کہ اگر سارے ہندوؤں کے اسلام قبول کرنے کی دعا مانگتا تو وہ بھی قبول ہو گئی ہوتی ــــ ان کا وصال ۴۲۵ھ/ ۱۰۳۳ء میں ہوا۔

داتا صاحب نے حضرت خرقانیؒ کے واقعات شیخ ابو سعید فضل اللہ بن محمد المیہنیؒ کے خادم حسن مؤدب اور اپنے استاد ابوالقاسم قشیریؒ سے سُنے تھے۔[۵]

چوتھے بزرگ حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بالداستانیؒ ہیں ــــ داتا صاحبؒ نے ان کا ذکر شیخ سہلکی سے سنا تھا۔ دارشکوہ نے ان کی عرفیت داستانی لکھی ہے اور وفات رجب ۴۱۷ھ/ ستمبر ۱۰۲۶ء میں بتائی ہے۔[۶]

پانچویں بزرگ حضرت ابوسعید فضل بن محمد المیہنیؒ ہیں۔ ان کا ذکر شیخ ابومسلم فارسی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا اور ان کے مزار پر ایک حیران کن چشم دید واقعہ قلمبند کیا ہے

تاریخ وفات ۴ شعبان ۴۶۰ھ / ۱۲ جنوری ۱۰۶۹ء بتائی جاتی ہے ــــ ان کے بعد ان بزرگوں کے احوال لکھے ہیں جن سے داتا صاحبؒ نے براہ راست اکتساب کیا تھا۔

حضرت ابو الفضل محمد بن الحسین الختلیؒ

حضرت ابو الفضل الختلیؒ داتا صاحب کے مرشد تھے۔ ختل کے رہنے والے تھے ــــ جو بدخشاں کے مغرب میں دریائے جیحوں کے دائیں کنارے پر ایک علاقے کا نام ہے۔ مقدسی نے اس کا صدر مقام هلبک بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سرحد سندھ سے ملتی ہے۔ علاقہ بڑا خوشحال ہے۔ داتا صاحب نے بتایا ہے کہ آپ تفسیر اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے ــــ تصوف میں جنیدؒ کے پیرو، حضرت حصریؒ کے مرید و رازدان اور ابو عمر قزوینی، اور ابو الحسن بن سالبہ رحمہما اللہ کے ہم عصر تھے۔ بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ پورے ساٹھ سال تک سچی گوشہ نشینی کی وجہ سے پہاڑوں میں چھپے رہے۔ چھپن برس تک ایک ہی لباس پہنے رکھا، جہاں سے پھٹ جاتا وہاں پیوند لگا لیتے۔ قیام زیادہ تر کوہ لکام میں رہا۔ (کوہ لکام سلسلہ کوہ لبنان ANTI -TAU TUS کا وہ حصہ ہے جو انطاکیہ اور مصیصہ کے متصل ہے)۔

آپ کی کرامتیں اور دلیلیں بہت ہیں ــــ آپ صوفیانہ رسم و لباس کے پابند نہ تھے بلکہ اہلِ رسم کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ لباس کے معاملہ میں داتا صاحب خود بھی کوئی التزام نہیں کرتے تھے۔ خدا نے گدڑی دی تو وہ پہن لی قبا دی تو وہ پہن لی اور اگر ننگا رکھا تو ننگا رہنا ہی پسند کیا۔ کئی جگہوں پر مرشد کے ہمراہ سفر و سیاحت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جس دن انتقال فرمایا اس دن بیت الجن میں تھے جو بانیان اور دمشق کے درمیان ایک گھاٹی کے پاس ایک گاؤں ہے۔ سر داتا صاحب کی گود میں رکھا تھا۔ لوگوں کی عادت کے مطابق داتا صاحب کے دل میں

ایک سچے دوست کی جدائی کا بڑا غم تھا۔ آپ نے داتا صاحب سے کہا۔

"اے پسر میں تجھے اعتقاد کا ایک مسئلہ بتاتا ہوں۔ اگر خود کو اس کے مطابق ڈھال لے گا تو سب رنجوں سے رہائی پالے گا۔ جان لے کہ سب مقامات و حالات میں نیک و بد اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں اس لئے تجھے اللہ کے فعل پر نہ کوئی جھگڑا کرنا چاہیئے اور نہ دل میں رنج کرنا چاہیئے۔"

اس کے سوا کوئی بھی وصیت نہ فرمائی اور جان دے دی۔ ان کا سالِ وصال ۴۶۰ھ/۶۸-۱۰۶۷ء بتایا جاتا ہے۔

حضرت ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن القشیریؒ

داتا صاحب نے ان کا ذکر "اسلام کی زینت اور مسلمانوں کے بزرگ رہنما" کے اوصاف سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"آپ کا حال اور فضیلتیں اہل زمانہ کو معلوم ہیں۔ ہر فن میں آپ کے لطیف اقوال اور محققانہ تصانیف موجود ہیں خدا تعالیٰ نے آپ کے حال اور زبان کو فضول باتوں سے محفوظ رکھا تھا۔ ایک دفعہ میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے کہ تصوف کی مثال برسام کی بیماری (چھاتی کی سوجن، سینے کا درد، پھیپھڑوں میں پانی بھر جانا) جیسی ہے کہ اس کی ابتداء بکواس اور انتہا خاموشی ہے اور جب قائم ہو گئی تو بالکل گونگا رہ گیا۔"

اسی طرح فقر و غنا کے بارے میں استاد قشیریؒ سے سنا ہوا مقولہ رقم کیا ہے ۔
الحسین بن منصور الحلاجؒ کے تذکرہ میں استاد قشیریؒ کی یہ رائے لکھی ہے کہ :

"اگر وہ اہلِ معانی و حقیقت میں سے ایک بزرگ ہوتے ہیں تو لوگوں کے ترک کرنے سے وہ ہرگز متروک اور مردود نہیں ہو سکتے ۔ اور اگر وہ طریقت میں متروک اور حق تعالےٰ کی طرف سے مردود ہیں تو لوگوں کے قبول کرنے سے وہ مقبول نہیں ہو سکتے ۔"

حضرت خرقانیؒ کے تذکرہ میں لکھا ہے :

"حضرت استاد قشیریؒ سے سنا ہے کہ آپ جب ولایت خرقان میں داخل ہوتے تو پیرِ کامل حضرت خرقانیؒ کی حشمت اور دبدبہ کی وجہ سے ساری فصاحت اور بیان کرنے کی طاقت جاتی رہی خیال ہوا کہ شاید اپنی ولایت سے معزول ہو گئے ہیں "

آگے چل کر استاد قشیریؒ سے حضرت طبرانی کے متعلق سنا ہوا واقعہ لکھا ہے کہ آپ کو پتھر کی ضرورت تھی ۔ سرخس کے دریا سے جو پتھر اٹھاتے ، موتی بن جاتا ۔ اسے دریا میں پھینک دیتے کیونکہ آپ کے نزدیک دونوں یکساں حقیر تھے ۔ پھر محبت کے بارے میں اُستاد قشیریؒ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ "محبت یہ ہے کہ محب اپنے کل اوصاف کو اپنے محبوب کی طلب میں محو کر دے اور یہ محبوب یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو ثابت کرنا ہے ۔"

آخر میں استاد ابوالقاسم قشیریؒ کی ایک تصنیف کا حوالہ دیا ہے جو حقوقِ صحبت کے موضوع پر تھی ۔ داتا صاحب نے اس کتاب کا نام نہیں لکھا ۔ ہم تک حضرت قشیریؒ کی ایک ہی کتاب " رسالۃ القشیریہ " پہنچی ہے ۔ شاید داتا صاحب کی مراد اسی کتاب سے ہو ۔ ان کی تاریخ وفات ۱۶ ربیع الثانی ۴۶۸ھ / ۲۹ اکتوبر ۱۰۷۵ء ہے ۔ مگر ابن خلکان اور جامیؒ نے ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء لکھی ہے ۔

حضرت ابوالعباس احمد بن محمد الاشقانی رح

داتا صاحب رح نے لکھا ہے کہ حضرت اشقانی رح اپنے وقت میں طریقت میں منفرد اور علم اصول و فروع کی تمام انواع کے امام تھے۔ بڑے جلیل القدر صوفی تھے ــــ اور اپنے طریق کو مغلق عبارت میں فنا سے تعبیر کرتے تھے اور یہ طرزِ تحریر انہی سے مخصوص تھا

"میں نے بعض جاہلوں کو آپ کے اس بیان کی تقلید کرتے دیکھا ہے حالانکہ تقلید تو معنی میں بھی اچھی نہیں ہوتی بھلا عبارت کی تقلید کیسے درست ہو سکتی ہے"

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

"مجھے آپ سے بہت اُنس تھا اور آپ کی بھی مجھ پر سچی شفقت تھی۔ بعض علوم میں میرے استاد تھے" شریعت کی ازحد تعظیم کرتے تھے۔ مخلوق سے تعلق قطع کیا ہوا تھا۔ علم اصول میں آپ کی عبارت اسقدر مشکل تھی کہ محقق امام کے سوا کسی کو آپ سے فائدہ نہیں ہوتا تھا"

حضرت حسین بن منصور الحلاج کے باب میں لکھا ہے کہ شیخ ابوالعباس نے ان کے معاملہ کو راز میں رکھا ہے ــــ مجاہدۂ نفس کے باب میں ان کا یہ قول لکھا ہے کہ ایک دن گھر میں داخل ہوئے تو زرد رنگ کے ایک کتے کو اپنی جگہ سویا دیکھا۔ اسے نکالنے کا ارادہ کیا تو دامن میں گھس کر غائب ہو گیا۔ یہ نفس تھا۔ گیارھویں پردے کو کھولتے ہوئے اپنا یہ واقعہ رقم کیا ہے :

"ایک روز میں ان کی خدمت میں حاضر تھا تو یہ آیت پڑھ رہے تھے (ترجمہ) وہ غلام جو کسی دوسرے کا مملوک ہے اور کسی کام کو کرنے پر

قادر نہیں - یہ آیت پڑھ پڑھ کر اتنا روئے کہ میں نے سمجھا کہ دنیا
سے رحلت کر گئے - بعد ازاں میں نے پوچھا : اے شیخ ! یہ کیا حالت
ہے ؟ تو آپ نے فرمایا کہ گیارہ سال سے میرا درس اس مقام
تک پہنچا ہے اور اس سے آگے نہیں نکل سکا ہوں - میں نے پوچھا
اے شیخ ! آپ ہر روز کتنا قرآن پڑھتے ہیں ؟ تو فرمایا : اس سے
پہلے رات دن میں دو دفعہ قرآن ختم کیا کرتا تھا لیکن اب چودہ سال
سے میں ابھی تک سورہ انفال تک پہنچا ہوں "

اسی طرح ہوس انگیز اشعار سننے کی کراہیت کے باب میں بھی آپ کی ایک روایت بیان کی
گئی ہے[۱] - شیخ اشقانی رح نے ۷۹ھ/۱۰۸۶ء میں وفات پائی -

حضرت ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ الگرگانی رح

داتا صاحب نے انھیں اپنے زمانہ کے ایک قطب اور یکتا لکھا ہے - طریقت کی خاطر
کئی کٹھن سفر سخت شرائط کے ساتھ کئے - مریدوں کی الجھنیں دور کرنے میں بے مثال
تھے - تمام اقسام کے علوم کے ماہر تھے - آپ کے مریدوں میں سے ہر ایک زمانے کا
سردار ہوا ہے مثلاً حضرت ابو علی فضل بن محمد فارمدی رح نے ساری دنیا سے اعراض کر
کے اپنا حصہ شیخ گرگانی رح کے حق میں چھوڑ دیا تھا (حضرت فارمدی رح کے مریدوں میں امام غزالی رح
خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں (دیکھئے الغزالی صفحات ۲۱-۲۰)

داتا صاحب لکھتے ہیں :

"ایک دن میں حضرت شیخ کے پاس بیٹھا اپنے احوال و مشاہدات
عرض کر رہا تھا کہ کھوٹے کھرے کی پرکھ ہو جائے - آپ اپنے وقت
کے بہترین نقاد اور کھرا کرنے والے ہیں - آپ میری معروضات

کو بڑے احترام سے سن رہے تھے اور مجھے بچپن کے غرور اور جوانی
کی گرمی نے اس بات پر اکسایا کہ شاید حضرت شیخ کا ابتدا میں
اس کوچہ سے گزر ہی نہیں ہوا کہ آپ اتنی عاجزی اور انکسار ظاہر
فرمارہے ہیں۔ آپ میرے باطن سے آگاہ ہوئے اور فرمایا: اے
دوست! جان لے کہ میری یہ عاجزی نہ تیرے لئے ہے اور نہ تیرے
حال کے لئے بلکہ میں یہ عاجزی احوال کے تبدیل کرنے والے مریدوں
کو آداب صحبت سکھانے کی خاطر اختیار کرتا ہوں۔ یہ سب طالبان
حق کے لئے عام ہے تیرے لئے خاص نہیں۔ جب میں نے
یہ بات سنی تو حیران رہ گیا۔ آپ نے فرمایا: اے بیٹے! آدمی کو
طریقت میں اس سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا کہ جب مرشد کسی
کو طریقت سے وابستہ کرتے ہیں تو اسے طریقت کے حاصل کر
لینے کا غرور پیچھے دھکیل دیتا ہے اور جب اسے طریقت سے
معزول کر دیتے ہیں تو وہ اپنا زعم باطل بیان کرنے سے بھی
معذور ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد مجھے آپ سے
بہت سے اسرار معلوم ہوئے۔"

نفس کے باب میں بیان کیا ہے کہ شیخ گرگانی رح نے نفس کو ایک سانپ کی صورت میں دیکھا تھا۔ الحلاج کے ضمن میں لکھا ہے کہ حضرت گرگانی رح نے ان کے معاملہ کو راز میں رکھا ہے۔ کرامت اولیائے کے باب میں لکھا ہے کہ مجھے ایک مشکل مسئلہ درپیش ہوا تو اس کے حل کے لئے طوس میں حضرت گرگانی رح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب میں وہاں پہنچا تو آپ اپنے گھر کے نزدیک مسجد میں تنہا تھے اور میں نے دیکھا کہ بعینہ میری اس مشکل کا حل ایک ستون سے بیان فرما رہے تھے۔ چنانچہ میں نے سوال کئے بغیر اپنا جواب پالیا۔ میں نے پوچھا کہ اے شیخ!

آپ یہ واقعہ کس سے بیان فرما رہے ہیں ؟ فرمایا : اے بیٹے حق تعالے نے اس وقت اس ستون کو میرے لئے ناطق کر دیا اور اس نے مجھ سے سوال پوچھا "

آخر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ـــــ ایک دن میں نے شیخ گرگانی رح سے پوچھا کہ صحبت کی شرط کیا ہے ؛ تو فرمایا کہ صحبت میں اپنا حصہ طلب نہ کرے کیونکہ صحبت کی تمام خرابیاں اسی وجہ سے ہیں "

حضرت گرگانی رح نے طوس میں ۴۵۰ھ/۱۰۵۸ء میں وفات پائی ۔

حضرت ابو احمد المظفر بن احمد بن حمدان رح

صوفیائے متاخرین کے اماموں میں آخری تذکرہ آپ کا ہے ۔ انہیں اولیاء کے رئیس اور اہل صفوت کے ناصح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ میں نے آپ سے سنا کہ جو کچھ دوسرے بزرگوں کو وادیوں اور جنگلوں میں مارے مارے پھرنے سے ملا وہ مجھے مسند اور بالانشینی کے درمیان مل گیا ہے "

آگے لکھتے ہیں :

" ایک روز میں موسم گرما میں آپ کے پاس سفر کا لباس پہنے تھکا ماندہ حاضر ہوا ۔ آپ نے فرمایا : اے ابوالحسن مجھے بتاؤ اس وقت تمہارا ارادہ کیا ہے ؟ میں نے عرض کیا کہ اس وقت مجھے سماع کی ضرورت ہے آپ نے اسی وقت آدمی بھیجکر قوال اور اہل عشرت کی ایک جماعت کو بلایا ۔ سماع کے ابتداء ہی میں بچپن کے جوش و ارادہ اور سوزش محبت نے مجھے بے قرار کر دیا ۔ جب کچھ وقت گزر گیا اور اس آفت کا جوش و غلبہ مجھ میں کسی قدر کم ہوا تو آپ نے مجھ سے پوچھا یہ سماع تیرے لئے کیسا رہا ؟ میں نے کہا : اے شیخ ! میں بہت خوش ہوا

آپ نے فرمایا: ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ راگ اور کوّے کی
آواز تیرے لئے یکساں ہو گی کیونکہ سماع کی قوت اسی وقت
ہوتی ہے کہ مشاہدہ حق نہ ہو۔ جب مشاہدہ حاصل ہو جائے تو سماع
کی قوت معدوم ہو جاتی ہے۔ دیکھو اس سماع کو اپنی عادت نہ بنا
لینا کہ طبیعت ثانیہ ہو جائے اور اس کی وجہ سے تم اصل مقصود
سے باز رہ جاؤ[۱۲]"

ان کے بعد داتا صاحبؒ نے اپنے ۴۳ معاصرین کا ذکر متأخرین صوفیائے کرام کے
عنوان سے کیا ہے لکھتے ہیں:

"اگر میں ان تمام صوفیاء کا حال اس کتاب میں بیان کروں جو مختلف
شہروں میں بندگانِ خدا کی اصلاح میں مشغول ہیں تو یہ کتاب طویل
ہو جائے گی اور اگر بعض صوفیاء کا حال چھوڑ دوں تو کتاب کا مقصد
پورا نہ ہوگا۔ اس وجہ سے میں اہلِ رسم کو چھوڑ کر اپنے عہد کے فقط
ان صوفیا اور مشائخ کے مختصر حالات لکھتا ہوں جو اربابِ معنی
اور محرم اسرار ربانی ہیں۔"

اس کے بعد عالم اسلام کے مختلف خطوں کے ذیلی عنوان قائم کر کے مختلف بزرگوں پر
ایک ایک دو سطریں لکھی ہیں۔

شام و عراق

(۱) شیخ زکی ابن علاءؒ: آپ اپنے وقت کے بزرگ مشائخ اور سرداروں میں سے
تھے۔ میں نے آپ کو آتشِ محبت کے شعلوں میں سے ایک شعلہ کی طرح پایا۔ آپ کی
کرامتیں اور دلیلیں ظاہر تھیں۔

(۲) شیخ بزرگوار ابو جعفر المصباح الصیدلانیؒ

آپ اہلِ تصرف کے رئیسوں میں تھے۔ تحقیق معارف میں آپ کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ زبان بہت اچھی تھی اور حسین بن منصور حلاجؒ سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ میں نے آپ کی بعض تصانیف آپ ہی سے پڑھی تھیں۔

(۳) شیخ ابو القاسم سُدسی:

آپ بڑے با مجاہدہ پیر اور نیک حال بزرگ تھے ــــ درویشوں کے محافظ اور ان کے حق میں بہت اچھا اعتقاد رکھتے ہیں۔

اہلِ فارس

(۴) شیخ الشیوخ ابو الحسن بن سالبہؒ:

آپ تصوف میں نہایت فصیح زبان رکھتے ہیں اور توحید میں ان کا بیان نہایت واضح ہوتا ہے۔

(۵) شیخ مرشد ابو اسحاق بن شہریارؒ:

آپ باحشمت صوفیا میں سے تھے اور پورا پورا انتظامی ملکہ رکھتے تھے۔

(۶) شیخ طریقت ابو الحسن علی بن بکرانؒ:

صوفی بزرگوں میں سے تھے۔ کشف المحجوب (صفحہ ۲۰۰) پر آپ سے حضرت ابی عبداللہ محمد بن خفیف شیرازیؒ کے متعلق سنی ہوئی روایت رقم کی ہے۔

(۷) شیخ ابو مسلمؒ: نادر الوقت اور نیک حال بزرگ تھے۔

(۸) شیخ ابو الفتح سالبہؒ:

آپ اپنے باپ (ابو الحسن بن سالبہؒ) کے نیک بیٹے ہیں اور بلند درجات کے امیدوار ہیں۔

(۹) شیخ ابوطالبؒ : آپ کلمات حق کے گرفتار تھے۔
داتا صاحب نے تصریح فرمائی ہے کہ ان میں سے شیخ الشیوخ ابو اسحاقؒ کو خود نہیں دیکھا تھا۔

قہستان، آذربائیجان اور طبرستان

(۱۰) شیخ شفیق فرج معروف بہ اخی زنجانیؒ :
آپ بہت نیک سیرت اور پسندیدہ طریقت بزرگ تھے۔

(۱۱) شیخ بدرالدینؒ :
صوفیوں کے بزرگوں میں سے ہوتے ہیں۔ آپکے نیک کام بہت ہیں۔ (یہ تمام نکلسن سے لیا گیا ہے)

(۱۲) بادشاہ تائبؒ : آپ راہ حق میں بہت ہی تیز گام بزرگ تھے۔

(۱۳) شیخ ابوعبداللہ جنیدیؒ : آپ بڑے نرم دل اور محترم بزرگ تھے

(۱۴) شیخ ابوطاہر مکشوفؒ :۔ آپ اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگوں میں سے تھے

(۱۵) خواجہ حسن سمنانیؒ : بڑے درویش صوفیوں میں سے تھے

(۱۶) شیخ سہلکی : بڑے درویش صوفیوں میں سے تھے۔ صفحہ ایران سے حضرت ابوعبداللہ داغستانیؒ کی روایات سننے کا ذکر کیا ہے۔

(۱۷) احمد پسر شیخ خرقانیؒ : اپنے باپ کے نیک جانشین تھے۔

(۱۸) ادیب کمندیؒ : آپ زمانہ کے سرداروں میں ہوتے ہیں۔ اثبات ادب کے باب میں (صفحہ ۱۷۰) کمند نامی گاؤں میں ان سے ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ آپ ۲۰ سال سے کنڑے اور نماز میں تشہد کے سوا کسی

وقت نہ بیٹھتے تھے۔

کرمان

(۱۹) خواجہ علی الحسین السیرکانی رح: آپ وقت کے سیاح ہوئے ہیں اور آپ نے بہت اچھے سفر کئے۔

(۲۰) حکیم پسر خواجہ علی رح: ایک نادر بزرگ ہیں۔

(۲۱) شیخ محمد بن سلمہ رح: وقت کے بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔

خراسان

(۲۲) شیخ مجتہد ابوالعباس رح ـــــ آپ کا وقت خوش اور زندگی خوب تھی۔

(۲۳) خواجہ ابوجعفر محمد بن علی الجواری رح: آپ بزرگ صوفی اور محقق ہوئے ہیں۔

(۲۴) خواجہ ابوجعفر ترشیزی رح: آپ وقت کے عزیزوں میں تھے۔

(۲۵) خواجہ محمود نیشاپوری رح: وقت کے پیشوا تھے۔ بیانِ طریقت میں آپ کی زبان بہت اچھی تھی۔

(۲۶) شیخ محمد معشوق رح: آپ کی زندگی اور وقت بہت اچھے تھے۔ آپ عشق الٰہی کی چنگاری، نیک باطن اور خوش و خرم رہنما تھے۔

(۲۷) خواجہ رشید مظفر پسر شیخ ابوسعید رح: امید ہے آپ قوم کے پیشوا اور دلوں کا قبلہ ہوں گے!

(۲۸) خواجہ احمد حمادی سرخسی رح: آپ وقت کے مردمیدان ہوئے ہیں اور ایک مدت تک میرے رفیق رہے ہیں۔ میں نے آپ کی بہت سی عجیب باتیں دیکھی ہیں آپ صوفی جوان مردوں میں سے ایک ہیں۔ آگے چل کر ایثار کے باب (صفحہ ۲۰۴) میں ان کی توبہ کی ابتدا کا قصہ لکھا ہے۔ نکاح او

تجرید کے باب (صفحہ ۴۱۳) میں بھی ان کا ذکر آیا ہے۔

(۲۹) شیخ احمد بخار سمرقندیؒ: جو مرو میں مقیم تھے اور اپنے زمانہ کے شاہ تصوف تھے۔

(۳۰) شیخ ابوالحسن علی بن ابی طالب علی الاسودؒ: آپ اپنے باپ کے سچے جانشین — علو ہمت اور صدق و فراست میں اپنے زمانہ میں یگانہ تھے۔

داتا صاحبؒ یہاں وضاحت فرماتے ہیں کہ انھوں نے صرف خراسان میں تین سو صوفی ایسے دیکھے ہیں جو خاص مشرب رکھتے تھے اور ان میں سے ہر ایک۔ پورے زمانہ کے لئے کافی تھا۔

ماوراء النہر

(۳۱) ابوجعفر محمد بن الحسین الحرمیؒ: آپ کلماتِ حق سننے والے اور محبت حق میں گرفتار مرد تھے، آپ کی ہمت عالی اور وقت صاف تھا۔ درگاہ حق کے طالبان پر کامل شفقت رکھتے تھے۔

(۳۲) خواجہ ابومحمد بالغزیؒ: اپنے اصحاب میں نہایت باعزت تھے۔ آپ کا حال بہت اچھا اور معاملات بہت قوی تھے۔ روزہ کی حقیقت میں (صفحہ ۴۵۶) انہیں دانشمند ابومحمد بالغزیؒ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے انتقال کے وقت وہاں موجود تھے — اور انھوں نے ۸۰ دن سے کچھ نہ کھایا تھا اور کسی نماز میں بھی جماعت فوت نہ ہوئی تھی۔

(۳۳) احمد ایلاقیؒ: (شیخ وقت) زمانہ کے بزرگ اور رسوم و عادات کے تارک تھے۔

(۳۴) خواجہ عارفؒ: اپنے وقت میں یگانہ اور اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے۔

(۳۵) علی بن اسحاقؒ: اپنے زمانہ کے سردار اور باحشمت بزرگ تھے۔ آپ کی زبان بہت اچھی تھی۔

غزنی

(۳۶) شیخ عارف ابوالفضل بن الاسدیؒ: اپنے زمانہ میں صاحب انصاف اور بڑے بزرگ رہنما ہوئے ہیں۔ آپ کی دلیلیں ظاہر ہیں اور آپ کی کرامتیں روشن ہیں۔ آپ آتش محبت الٰہی کا ایک شعلہ تھے۔ آپ اپنے زمانہ میں بالکل گمنام تھے۔

(۳۷) شیخ اسمٰعیل الشاشیؒ: آپ دنیا سے کنارہ کش اور باحشمت رہنما تھے اور سلامتی کے طریق پر چلتے تھے۔

(۳۸) شیخ سالار طبریؒ: آپ صوفی علماء میں سے تھے اور طریقت میں بہت اچھے حال کے مالک تھے۔

(۳۹) شیخ ابوعبداللہ محمد بن عبدالحکیم المعروف بمریدؒ: آپ بڑے ہوشیار، اسرار کے معدن اور درگاہ حق کے مستوں میں سے تھے اور طریقت میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ کا حال لوگوں سے پوشیدہ تھا۔ آپ کی دلیلیں ظاہر اور کرامتیں روشن ہیں۔

(۴۰) شیخ سعید بن ابی سعید العیارؒ: سب سے زیادہ محترم بزرگ ہیں۔ آپ حدیث کے حافظ تھے۔ عمر بہت طویل پائی تھی اور بہت سے مشائخؒ کو دیکھا تھا آپ قوی حال کے باخبر بزرگ تھے۔ اپنا بھید کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے۔

(۴۱) خواجہ بزرگوار ابوالعلاء عبدالرحیم بن احمد السعدیؒ: آپ حرمت اور وقار کی بنیاد، قوم کے عزیز اور وقت کے سردار تھے۔ میرا دل آپ سے بہت خوش ہے۔ آپ کا وقت مہذب اور حال اچھا تھا اور تمام علوم سے واقف تھے۔

(۴۲) شیخ اوحد قسورۃ بن محمد الجردیزیؒ (گردیزی) : اہلِ طریقت سے پوری شفقت رکھتے ہیں۔ اور ہر ایک کے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے۔ آپ نے بہت سے مشائخ کو دیکھا ہے۔[۱۳] (ان کی اولاد ملتان میں آباد ہے)

اس فہرست میں ایسے کئی بزرگوں کے نام شامل نہیں جن سے داتا صاحب کی ملاقات رہی تھی اور جن کا ذکر کشف المحجوب میں مختلف جگہوں پر آیا ہے ۔۔۔ ہم انہیں یکجا کئے دیتے ہیں !

(۱) پیر عبداللہ انصاری ہرویؒ کا یہ قول صفحہ ۲۶ پر لکھا ہے کہ:

"ہمارا غم ابدی ہے کیونکہ نہ تو ہماری ہمت کبھی مقصود کو پاتی ہے اور نہ دنیا و آخرت میں ہماری کلیت فنا ہوتی ہے۔"

یہ بزرگ داتا صاحبؒ کے ہمعصر تھے اور "طبقات الصوفیہ" انہی کی کاوش کا نتیجہ ہے جسے مولانا جامیؒ نے 'نفحات الانس' کے نام سے از سرِ نو مدون کیا اور اس میں اضافے کئے۔ حضرت انصاریؒ کا انتقال ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء میں ہوا۔

(۲) حضرت ابو مسلم فارس بن غالبؒ : داتا صاحبؒ نے فارس کے صوفیاء میں جن ابو مسلم ہروی کا ذکر کیا ہے وہ غالباً یہی بزرگ ہیں۔ صفحات ۱۷۲ اور ۸۸-۲۸۷ پر ان کی زبانی شیخ ابوسعید سے جھگڑے کا قصہ لکھا ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۳۵۱ پر — شیخ ابو مسلم سے ان کے کٹ جانے کا واقعہ لکھا ہے اور پھر صفحہ ۴۶۶ پر شیخ ابو مسلم کی زبانی سماع کے بارے میں دو روایتیں رقم کی ہیں۔

(۳) امام غزالیؒ : سے سرخس میں ان کے بچپن کا ایک واقعہ سُن کر صفحہ ۲۴۴ پر لکھا ہے۔

(۴) بابِ عمرؒ ؛ فرغانہ میں ان سے ملاقات کا حال لکھا ہے اور بتایا ہے کہ وہ میری توبہ کے دن سے نظرِ شفقت فرما رہے تھے۔ (صفحہ ۵۶-۲۵۵)

(۵) کشف المحجوب میں ولی کی تشریح میں استاد ابو اسحٰق اسفرائنی کی یہ رائے لکھی ہے۔ (صفحہ ۲۳۰) کہ ولی اپنے آپ کو نہیں پہچانتا۔

(۶) اسی صفحے پر استاد ابوبکر بن فورک کی یہ رائے لکھی ہے کہ ولی خود کو پہچانتا ہے۔ داتا صاحبؒ نے ان دونوں بزرگوں کو استاد لکھا ہے جس سے خیال گزرتا ہے کہ داتا صاحبؒ نے ان سے ملاقاتیں کی ہوں گی اور ان سے مسائل سیکھے ہوں گے۔ باسورتھ ان دونوں کو مسعود غزنوی کے ممتاز علماء بتاتا ہے۔[۱۴]

یہ تھے داتا صاحبؒ کے معاصرینؒ ــــ اور ان سے خود داتا صاحبؒ کے مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

باب ۱۰

افکار و نظریات

****

کشف المحجوب کے انگریزی ترجمہ کے پیش لفظ میں رینالڈ اے نکلسن نے داتا صاحب کے عقائد اور کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "آپ نے سنی اور حنفی ہونے کے باوجود اپنے زمانے سے پہلے اور بعد کے بہت سے صوفیوں کی طرح علم دین اور اعلیٰ درجے کے تصوف میں ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔ جس میں نظریہ فنا کو اہم مقام حاصل ہے"۔ لیکن داتا صاحب کم ہی اس انتہا تک گئے ہیں کہ انہیں وحدت وجودی کہنے کا جواز مل سکے۔ آپ اپنے مرشد الختلیؒ سے اس باب میں متفق ہیں کہ جنیدؒ کے نظریہ صحو کو سکر پر فوقیت حاصل ہے۔ آپ قارئین کو کثرت اور بڑے زور کیساتھ تنبیہہ کرتے ہیں کہ کوئی صوفی کتنے ہی بلند درجات تک کیوں نہ پہنچ جائے شریعت کی پابندی سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

نکلسن نے سماع اور الحلاج کے بارے میں اپنی بے جواز رائے پیش کرنے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ :

> " یہ امر واضح ہے کہ داتا صاحب تصوف کو اسلام کی حقیقی تعبیر قرار دینے میں بڑے بے تاب دکھائی دیتے ہیں — لیکن یہ بات بھی اتنی ہی یقینی ہے کہ ان کی تشریح و توجیہہ متن کتاب سے مطابقت نہیں رکھتی "۔

نکلسن نے اس مفروضہ عدم مطابقت کے ثبوت میں حاشیے میں لکھا ہے کہ :

"مصنف نے مذہب کے ظاہر کی بے حقیقتی پر اپنے نظریات بڑی
دلیری کے ساتھ حج کے باب میں پیش کئے ہیں"

نکلسن کی کم فہمی پر تعجب نہ ہونا چاہیئے ــــ وہ بہرحال تثلیث ہے موحد نہیں ــــ اسکی
یہ رائے بھی نظر انداز کر دینے کے لائق ہے کہ :

"الہجویری نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، کو خراج عقیدت پیش کیا
ہے اس کے باوجود تعلیمات کے بنیادی اصولوں کے سلسلہ میں انہیں
ان کے بڑے اور چھوٹے معاصرین، ابوسعید بن الخیر اور
عبداللہ انصاری سے علیحدہ نہیں کر سکتے"[1]

اگر نکلسن یہ کہنا چاہتا ہے کہ داتا صاحبؒ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عقیدت
رکھتے تھے مگر حضرت ابوسعیدؒ اور حضرت ابوعبداللہ انصاریؒ نہیں رکھتے تھے ــــ تو یہ
خیال کم فہمی سے زیادہ کج فہمی کے ذیل میں آئے گا۔

۔ کشف المحجوب کو جو چیز تصوف کی سابقہ کتابوں سے ممیز
کرتی ہے ــــ وہ داتا صاحب کا محققانہ اور مجتہدانہ انداز تحریر ہے
آپ مباحث سلوک پر رد و قدح میں بھی تامل نہیں کرتے اور
متقدمین کی آراء کے ساتھ یا ان کے خلاف واضح طور پر اپنی
رائے بھی پیش کرتے ہیں۔ دو کتابوں کے سرقہ کے باعث داتا
صاحب نے اپنی رائے بیان کرتے وقت اپنا نام لکھنے کی رسم قائم
کی ہے۔ اس کا نثر میں وہی لطف ہے جو نظم میں تخلص کا
ہوتا ہے ــــ ان آرا کو یکجا کر دیا جائے تو داتا صاحبؒ کے افکار و
نظریات کی نہایت واضح تصویر ابھر آتی ہے (۵) ذیل میں ہم :

ان تمام مباحث کو جن پر داتا صاحب نے طبع آزمائی کی ہے
مختلف عنوانوں کے تحت یکجا پیش کرتے ہیں:

علم و عمل

داتا صاحبؒ نے کشف المحجوب کے پہلے باب کا آغاز "ثبوت علم" کی بحث سے کیا ہے — قرآن و حدیث کے ذریعے علم حاصل کرنے کی فرضیت ثابت کرنے کے بعد لکھتے ہیں: —

"یہ جان لو کہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر تھوڑی ہے اس لئے تمام علوم اور فنون کا سیکھنا انسان پر فرض نہیں مثلاً علوم نجوم — حساب، طب اور علم بدیع کی تمام صنائع بدائع وغیرہ کا پڑھنا کوئی ضروری نہیں — البتہ نجوم کا سیکھنا اسقدر ضروری ہے جس سے رات میں اوقات نماز معلوم ہو سکیں — علم طب اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بیماری سے بچنے کے لئے درکار ہے — اسی طرح وراثت اور دیگر امور کو سمجھنے کے لئے علم فقہ — غرضیکہ علم کا سیکھنا اس قدر فرض ہے جس سے عمل درست ہو[۲]"

مَیں نے عوام کا ایک گروہ دیکھا ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا گروہ عمل کو علم پر فوقیت دیتا ہے لیکن یہ دونوں امر باطل ہیں — اس لئے کہ علم کے بغیر عمل، عمل نہیں ہوتا — بلکہ عمل اسی وقت عمل ہوتا ہے جب علم اس کے ساتھ شامل ہو اور جو لوگ علم پر عمل کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ بھی غلط

ہیں ۔ کیونکہ عمل کے بغیر علم کو علم نہیں کہہ سکتے اگر عالم کا
علم اس کے قول و فعل سے کوئی تعلق نہ رکھے تو اس میں کچھ بھی ثواب نہیں۔"
"لوگوں کا ایک گروہ ہے جو علماء کو علم کی بدولت بلند مرتبہ سمجھتا
ہے اور ان کے اعمال کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا ۔۔ وہ علم کی تہہ تک
نہیں پہنچ سکتے، اس وجہ سے عمل کو علم سے جدا کرتے ہیں ۔ یہ
لوگ نہ علم رکھتے ہیں نہ عمل ہی کرتے ہیں ۔ اور جو لوگ علم سے
مرتبہ اور دنیا کی عزت طلب کرتے ہیں وہ عالم نہیں ہوتے کیونکہ
مرتبہ اور دنیا کی عزت جہالت کے لوازم میں سے ہیں۔"

اس کے بعد داتا صاحبؒ نے بتایا ہے کہ علم دو قسم کا ہوتا ہے ایک علم الٰہی ۔ اور دوسرا علم مخلوق ۔ پھر وضاحت کی ہے کہ انسان کو جس علم کی ضرورت ہے وہ امورِ الٰہی اور خدا کی معرفت کا علم ہے ۔ انسان پر مصلحت وقت کا علم بھی ضروری ہے اور جو علم بوقت ضرورت انسان کے کام آتا ہے ۔۔ اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ۔۔ علم فروع کا ظاہر معاملات دینی کو عمل میں لانا ہے اور اس کا باطن نیت کا صحیح کرنا ۔ ان میں سے ہر ایک کا قیام دوسری قسم کے بغیر محال ہے۔

طریقت اور شریعت

داتا صاحب کے نزدیک طریقت و شریعت لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں :-
" طریقت کا ظاہر باطن کے بغیر منافقت ہے اور باطن بغیر ظاہر بے دینی ہے ۔
پس علم حقیقت (طریقت) کے تین رکن ہیں :

(۱) ذات الٰہی، اس کی وحدانیت اور اس سے تشبیہہ کی نفی کا علم
(۲) صفات الٰہی اور اس کے احکام کا علم ۔۔ اور
(۳) افعال الٰہی اور ان کی حکمت کا علم ۔

اسی طرح شریعت کے علم کے بھی تین ارکان ہیں :

(۱) علمِ کتابِ الٰہی (۲) علمِ سنتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم اور

(۳) علمِ اجماعِ اُمّت ۔

پھر ان کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ــــ علم ذات الٰہی کی شرط یہ ہے کہ عاقل بالغ انسان یہ اچھی طرح جان لے کہ اللہ ہمیشہ سے تھا ، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس کی ابتدا ہے نہ انتہا ــــ وہ کسی خاص مکان اور جہت میں نہیں ــــ اس کی ذات نقص سے پاک ہے ۔ مخلوق میں اس کی مانند کوئی نہیں ــ جو کچھ تمہارے وہم و عقل میں متصور ہوتا ہے وہ ان سب کا پیدا کرنے والا ہے ۔ صفات الٰہی کو جاننے کی شرط یہ ہے کہ اس کی صفات اس کی ذات کے ساتھ موجود ہیں ــــ نہ عین ذات ہیں اور نہ ہی غیر اور اس سے جدا ہیں ۔

افعال الٰہی کا علم یہ ہے کہ تم جانو کہ اللہ تعالےٰ تمام مخلوقات اور ان کے افعال کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام عالم اس کے حکم سے عدم سے وجود میں آیا ــــ وہ خیر و شر کا اندازہ کرنے والا اور نفع و ضرر کا خالق ہے ۔اس کے بعد شریعت کے احکام کے اثبات کی دلیل یہ دی ہے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے ہمارے پاس اس کے رسولؐ خارق عادت معجزات لے کر آتے ہیں اور جو کچھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے پوشیدہ اور ظاہر اُمور کے متعلق خبر دی ہے وہ حق ہے ۔ شریعت کا رکن اول کتاب الٰہی ہے ، دوسرا رکن سنت نبویؐ ہے اور تیسرا رکن اجماع امت ہے[۲]۔

اسی ضمن میں فرماتے ہیں :

" علم من اللہ علم شریعت ہے اور علم مع اللہ طریق حق اور قرب الٰہی کے مقامات اور اولیاء کے درجات بیان کرنے کا علم ہے پس معرفت الٰہی شریعت کو قبول کئے بغیر صحیح نہیں ہو سکتی "

آگے ایک مقام پر لکھتے ہیں :

" شریعت حقیقت کی اصل ہے — تمام اوامر و نواہی کی پیروی شریعت ہے جو حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔"[۶]

فرقہ حلولیہ کے بیان میں لکھتے ہیں :

" میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ میں نہیں جانتا — کہ فارس اور ابوحلمان کون ہوئے ہیں اور انھوں نے کیا کہا ہے ؟ جو شخص ایسے اقوال کا قائل ہو جو توحید الٰہی اور تحقیق کے خلاف ہیں تو اس کو دین میں کچھ حصہ نہیں — کیونکہ جب دین جو اصل ہے مضبوط نہ ہو تو تصوّف جو اس دین کی فرع اور نتیجہ ہے اس میں زیادہ خلل ہوگا۔"[۹]

اصطلاحاتِ صوفیا کے باب میں لکھتے ہیں :

" شریعت بندہ کا فعل ہے اور حقیقت خداوند تعالیٰ کی نگہبانی۔ پس شریعت کا قائم کرنا حقیقت کے وجود کے بغیر محال ہے اور حقیقت کا قائم کرنا — شریعت کی حفاظت کے بغیر محال ہے۔ غرضیکہ شریعت بغیر حقیقت کے ریا ہے اور حقیقت بغیر شریعت کے منافقت ہے۔"[۱۰]

مجاہدہ و مشاہدہ

اس باب میں داتا صاحب نے دو نظریات بیان کئے ہیں : ایک یہ کہ مجاہدہ — مشاہدۂ حق کی علت ہے اور دوسرا یہ کہ حق تک پہنچنے کی کوئی علت نہیں کیونکہ جو بھی حق تعالیٰ تک پہنچا وہ اس کے فضل سے پہنچا اور اس کے فضل کو بندہ کے افعال

سے کیا کام ؟ اس لئے محال ہے کہ مجاہدہ مشاہدہ کی علت ہو۔ داتا صاحب اس اختلاف کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں :

"میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ یہ اختلافات صرف عبارات میں ہیں معنی میں نہیں — اس لئے کہ ایک تو کہتا ہے کہ جس نے ڈھونڈا پالیا۔ اور دوسرا کہتا ہے جس نے پالیا طلب کیا ایک تو مجاہدہ کرتا ہے کہ مشاہدہ پالے اور دوسرا مشاہدہ کرتا ہے کہ مجاہدہ پالے — اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ مجاہدہ مشاہدہ کے لئے بالکل ویسا ہی ہے جیسا عبادت کے لئے توفیق اور بخششِ الٰہی۔ پس جیسے بلا توفیقِ الٰہی بندگی کا حاصل ہونا محال ہے ویسے ہی بندگی کے بغیر توفیق کا حاصل ہونا بھی محال ہے اور جس طرح مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے حاصل نہیں ہوتا اسی طرح مجاہدہ بھی بغیر مشاہدہ کے محال ہے[۱۱]"

ولی کون ہوتا ہے ؟

داتا صاحب نے لکھا ہے :-

"جاننا چاہیئے کہ تصوف و طریقِ معرفت کی بنیاد درحقیقت اصولِ ولایت اور اس کے ثابت کرنے پر قائم ہے اور تمام مشائخ اس کے اثبات میں گو متفق ہیں — تاہم ہر ایک نے ولایت کا مفہوم مختلف عبارات میں بیان کیا ہے "

اس کے بعد ولی کے لغوی معنوں پر روشنی ڈالنے کے بعد مختلف مشائخ کے اقوال پیش کئے ہیں اور پھر اپنی رائے ان الفاظ میں بیان کی ہے :

"میری مراد ولایت اور اس کے ثابت کرنے سے یہ ہے کہ تم جان لو کہ ولی کا نام صرف اس شخص کے لئے جائز ہے۔ جس میں ولی کے اوصاف موجود ہوں — وہ ظاہر و باطن میں اللہ تعالےٰ کا دوست اور اللہ کے جملہ احکام کا پابند ہو۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

"ولی وہ ہیں جنکا مقصود اللہ کے سوا اور کچھ نہیں اور نہ اس کے سوا ان کو کسی اور سے انس ہے۔ ہم سے پہلے زمانوں میں ولی ہوتے ہیں ، اب بھی ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے۔ اس لئے کہ خدا نے اس امت کو تمام سابقہ امتوں پر شرف عطا فرما کر یہ ذمہ لیا ہے کہ شریعت محمدی صلے اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ محفوظ رکھیں گے۔"

اس بحث کے اخیر میں لکھتے ہیں :

"ملحدین کے ایک گروہ نے ، اللہ ان پر لعنت کرے — اس بزرگ طریق یعنی تصوف سے تعلّق پیدا کر لیا ہے اور کہتے ہیں کہ ریاضت و مجاہدہ اتنا چاہیئے کہ بالآخر بندہ ولی ہو جائے اور جب وہ ولی ہوگیا تو عمل کی ضرورت نہ رہی — یہ کھلی گمراہی ہے۔ حق تعالےٰ کے راستہ میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں شریعت کے ارکان میں سے کوئی رکن اُٹھ جائے اور اس کی ضرورت باقی نہ رہے۔"

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں :

یاد رکھو ولایت میں سنت نبوی کی پیروی لازمی ہے[۱۲]۔"

ایمان

داتا صاحب ایمان کے بارے میں قرآن اور حدیث کی اسناد پیش کرنے کے بعد مختلف مکاتب فکر کے خیالات پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

" معتزلہ تمام عبادات علمی و عملی کو ایمان کہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ بندہ کو گناہِ کبیرہ کے سبب خارج از ایمان جانتے ہیں خارجیوں کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ وہ بندہ کو گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں ـــ اسی طرح ایک اور گروہ ایمان کو صرف قول کہتا ہے۔ ایک اور گروہ صرف معرفت کو ایمان کہتا ہے "[۱۱]

ان مختلف آراء پر بحث کے بعد اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :۔

" ایمان حقیقت میں بندے کے کل اوصاف کا طلب حق میں مستغرق ہو جانا ہے اور سب طالبان حق کو اس بات پر اتفاق کرنا چاہیئے کہ معرفت کے سلطان کا غلبہ ناشناسی کے اوصاف کو مغلوب کرنے والا ہوتا ہے اور جہاں ایمان ہو وہاں سے ناشناسی کے اسباب دور ہو جاتے ہیں "[۱۲]

طہارت

داتا صاحب لکھتے ہیں :

" ایمان لانے کے بعد سب سے پہلی چیز جو بندہ پر فرض ہے وہ نماز ادا کرنے کے لئے طہارت ہے "

طہارت کے احکام بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

" طہارت دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو جسم کی طہارت اور دوسری دل کی جس طرح بدنی طہارت کے بغیر نماز درست نہیں ہو سکتی اسی طرح دلی طہارت کے بغیر معرفت حق درست نہیں ہوتی۔ بدنی طہارت کے لئے خالص پانی کی ضرورت ہے اور دل کی طہارت کے لئے خالص توحید الٰہی درکار ہے خلط ملط اور پریشان اعتقاد درکار نہیں "

اس کے بعد وضو کے صوفیانہ معنی بیان فرماتے ہیں :

" ظاہر کی طہارت باطن کی طہارت کے موافق ہونی چاہیے۔ یعنی جب ہاتھ دھوئے تو چاہیئے کہ دل سے بھی دنیا کی محبت کو دھو ڈالے ــ جب استنجا کرے تو ظاہری نجاست کی طرح باطن سے غیر اللہ کی نجاست بھی صاف کر دے۔ جب منہ میں پانی ڈالے تو چاہیئے کہ منہ کو غیر اللہ کے ذکر سے خالی کر دے، اور جب ناک میں پانی ڈالے تو چاہیئے کہ ناجائز چیزوں کے سونگھنے کو اپنے اوپر حرام کرے اور جب منہ دھوئے، تو چاہیئے کہ تمام مرغوبات نفس سے یک لخت اعراض کرے اور حق تعالیٰ کیطرف توجہ کرے ــ جب بازوؤں کو دھوئے تو چاہیئے کہ تمام دنیاوی لذتوں سے ہاتھ اٹھالے اور جب سر کا مسح کرے تو چاہیئے کہ اپنے تمام امور کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے اور جب پاؤں دھوئے تو چاہیئے کہ سوائے موافق حکم الٰہی کے کھڑا نہ ہو۔ اس طرح دونوں طہارتیں حاصل

ہو جائیں گی کیونکہ شریعت کے تمام ظاہری کام باطن کے امور سے وابستہ ہیں جیسا کہ ایمان ہیں بظاہر تو زبان سے اقرار کیا جاتا ہے لیکن یہ دل کی تصدیق سے وابستہ ہے اور شریعت میں بندگی کے احکام ظاہر بدن پر دل کی نیت کے ساتھ مربوط ہیں ــــ پس دل کی طہارت کا طریقہ دنیا کی حیرانی میں تدبر اور تفکر کرنا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ دنیا ایک بے وفا جگہ ہے اور فنا کا مقام ہے لہذا دل کو اس سے خالی کر دے اور یہ بات سخت مجاہدہ کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ــــ اور سب سے ضروری مجاہدہ ظاہر کے آداب کی حفاظت کرنا اور سب احوال میں ان پر مداومت کرنا ہے۔[14]

توبہ

"ظاہر کی طہارت پانی سے ہوتی ہے اور باطن کی طہارت توبہ کرنے اور خدا تعالیٰ کی جناب میں رجوع سے ہے۔"

پھر توبہ کے باب میں خدا اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بیان کرنے کے بعد معتزلہ اور خارجیوں کے اس عقیدہ کی تردید فرماتے ہیں کہ گناہ سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں :

> "اہل سنت وجماعت اور تمام مشائخ معرفت کے نزدیک یہ بات روا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک گناہ سے توبہ کر لے لیکن دوسرے گناہ کرتا رہے تو خدا تعالیٰ اس ایک گناہ سے باز رہنے کا ثواب اسے دے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اس ایک گناہ سے توبہ کی برکت سے وہ دوسرے گناہوں سے بھی باز آ جائے۔"[15]

نماز

نماز کے بارے میں احکام شریعت بیان کرنے کے بعد نماز کے لغوی معنوں پر بحث کی ہے اور پھر اس کے صوفیانہ معنی یہ بیان فرماتے ہیں :

" اللہ تعالےٰ کا حکم ہے کہ پانچ وقت پانچ نمازیں ادا کرو۔ نماز میں داخل ہونے کی کچھ شرطیں ہیں — پہلی ان میں سے جسم کی طہارت ہے جو ظاہر میں نجاست سے اور باطن میں خواہش نفسانی سے پاک ہونا ہے — دوسری لباس کی طہارت ہے جو ظاہر میں نجاست سے اور باطن میں مال حرام سے نجات حاصل کرنا ہے — تیسری مکان کی طہارت ہے جو ظاہر میں نجاست اور باطن میں فساد اور گناہ سے بچنا ہے — چوتھی قبلہ رو ہونا ہے ، قبلہ ظاہر کا کعبہ شریف اور باطن کا عرش معلےٰ اور مشاہدہ سر ہے — پانچویں شرط قیام ہے ، قیام ظاہر یہ ہے : کہ وقت درست ہو اور قیام باطن یہ ہے کہ حقیقت کے درجہ میں اس کا وقت ہمیشہ ہے — چھٹی شرط حق تعالیٰ کیطرف توجہ کر کے خالص نیت کرنا ہے — ساتویں ہیبت الٰہی اور اور فنائے صفت کے مقام میں تکبیر پڑھنا اور وصل کے محل میں قیام کرنا اور نہایت ترتیل کے ساتھ قرآت کرنا اور گڑگڑا کر رکوع اور عاجزی سے سجود اور دل جمعی کے ساتھ تشہد اور صفت کے فنا ہونے کے ساتھ سلام دینا ہے "

اس کے بعد اہلِ طریقت کے لیے نماز کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ :

"جاننا چاہیئے کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے کہ طالبان ابتدا سے انتہا تک اسی سے راہِ حق پاتے ہیں اور اسی میں ہمیشہ مشغول ہوتے ہیں اور ان کے مقامات عموماً اسی میں کشف ہوتے ہیں"۔

اس کے بعد نماز کے بارے میں دو مکاتبِ فکر کی آراء پیش کرتے ہیں کہ ایک کے نزدیک نماز دربارِ حق میں حاضری کا ذریعہ ہے اور دوسرے کے نزدیک نماز اپنے آپ سے غائب ہونے (غیبت) کا ذریعہ ہے۔ لیکن :

"میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ نماز حکمِ الٰہی ہے۔ یہ نہ تو حاضری کا ذریعہ ہے نہ غیبت کا، کیونکہ امرِ الٰہی کسی چیز کا آلہ نہیں ہو سکتا"۔

بعدازاں نماز کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مشائخِ طریقت کے اقوال و اعمال بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"صوفیائے کرام سے بعض لوگ فرائض کو تو ظاہر طور پر ادا کرتے ہیں اور نوافل کو مخفی طور پر۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ ریا سے چھوٹ جائیں کیونکہ جب کوئی شخص عمل میں دکھلاوا کرتا ہے تو وہ خلقت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے۔ سو وہ ریاکار ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ فرائض و نوافل سب کو ظاہر میں ادا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ریا باطل ہے اور عبادت حق ہے ہم باطل کی خاطر حق کو کیوں چھپائیں؟"

داتا صاحب اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"پس ریا کو دل سے نکال دو اور جہاں جیسے چاہو عبادت کرو"

پھر ایک بزرگ کے قول کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ نماز باجماعت پڑھی جائے اور جمعہ کسی جامع مسجد میں![15]

محبتِ الٰہی

داتا صاحب کے زمانہ تک تصوّف کو دو[2] ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے — پہلا دور خوف الٰہی اور عذاب کے خوف کا تھا — دوسرا دور محبت الٰہی کا تھا — ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے اپنی تصنیف "جنید بغداد" میں اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے[16] — داتا صاحب جنیدی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے مرشد حضرت ختلیؒ تھے۔ جو حضرت حصریؒ کے مرید اور راز دان تھے — اور حضرت حصریؒ حضرت شبلیؒ کے مرید تھے جو حضرت جنیدؒ کے قابل ذکر شاگرد تھے۔[17]

محبت الٰہی کا فلسفہ بعض لوگوں کو وحدت الوجود کے نظریہ میں لے گیا تھا اور اس کے ردعمل کے طور پر بعض لوگوں نے یہ قرار دیا تھا کہ اللہ کی محبت بندہ کے لئے اور بندہ کی محبت اللہ کے لئے جائز ہی نہیں — داتا صاحب تصوّف کے کسی مسئلہ میں بھی انتہا کو پسند نہیں فرماتے اور اس خاص موضوع پر بحث کرنے سے پہلے انھوں نے محبت الٰہی کے ثبوت میں قرآن و حدیث کی اسناد پیش کی ہیں — پھر لفظ محبت کے لغوی معنی پر بحث کی ہے اور اس ضمن میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے:

"حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی محبت بندہ کے لئے یہ ہے کہ اس پر نعمت زیادہ کرتا ہے — دنیا و عقبیٰ میں اسکو ثواب دیتا ہے۔ عذاب سے اسکو محفوظ رکھتا ہے اور گناہ سے اسکو بچاتا ہے۔ بلند احوال اور اونچے مقامات اس کو کرامت فرماتا

ہے ۔ اس کے باطن کو اغیار کی طرف توجہ کرنے سے ہٹا دینا ہے
اور اپنی ازلی عنایت سے اسے سرفراز کرنا ہے تاکہ وہ سب سے
جدا ہو کر اس کی رضا کی طلب کے لیے تنہا رہ جائے اور جب
اللہ تعالیٰ کسی بندہ کو ان امور سے مخصوص کر لیتا ہے ، تو
اللہ تعالیٰ کے اس مخصوص ارادہ کو محبت کا نام دیا جاتا ہے "

اور پھر فرماتے ہیں کہ :

" بندہ کی محبت اللہ تعالیٰ کے لئے ایک صفت ہے ــ جو
فرماں بردار مومن کے دل میں تعظیم، تکبیر اور تکریم کے معنی
میں پیدا ہوتی ہے تاکہ وہ محبوب برحق کی رضا طلب کرے ،
اس کے ذکر کا عادی ہو، اس کے سوا غیر کے ذکر سے بیزار
ہو اور اس کے حکم پر گردن جھکا دے "

اس کے بعد اس موضوع پر مشائخ کے اقوال پیش کر کے شریعت کے مکمل اتباع
کی ہدایت کی ہے۔[۱۸]

زکوٰۃ

اس باب میں داتا صاحب لکھتے ہیں :

" زکوٰۃ اسلام کے ارکان و فرائض میں سے ہے اور نعمت کے
پورا ہونے پر واجب ہوتی "

نصابِ زکوٰۃ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

" یاد رکھو کہ جس طرح مال پر زکوٰۃ فرض ہے اسی طرح مرتبہ
پر بھی زکوٰۃ فرض ہے کیونکہ وہ بھی پوری نعمت ہے ۔ مرتبہ کی

زکوٰۃ یہ ہے کہ اگر حاکم ہو تو انصاف کرے ۔ عالم و مفتی ہو تو
سفارش و رعایت اور اخلاص سے مسائل حق بیان کرے
اور اسی طرح باطن کی نعمت کی بھی زکوٰۃ ہے اور وہ یہ ہے کہ
حق تعالیٰ کی نعمت کا بے شمار شکر ادا کرے[19]۔"

روزہ

روزہ کی فرضیت کے بارے میں قرآن و حدیث کی اسناد پیش کرنے کے بعد روزہ
کی صوفیانہ تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"یاد رکھو کہ نفس کو روکنے کی بہت سی شرطیں ہیں : مثلاً
پیٹ کو کھانے سے اور پینے سے بچائے ، آنکھ کو نظر شہوت
سے ، کان کو غیبت سننے سے ، زبان کو لغو اور بے ہودہ باتوں
سے اور جسم کو دنیا کی متابعت اور شریعت کی مخالفت سے
محفوظ رکھے ۔ صرف اسی طرح وہ حقیقی طور پر روزہ دار ہوگا"

پھر خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوا یہ فرمان رقم کیا ہے کہ :

"اپنی زبان اور دوسرے سب حواس کو بند رکھ"

اس کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں :

"پس روزہ دار کو چاہئے کہ حواس خمسہ کو قابو میں رکھے یہانتک
کہ وہ حکم الٰہی کی مخالفت چھوڑ کر شریعت کی پوری طرح پیروی
کرے تاکہ صحیح معنوں میں روزہ دار کہلائے ۔ ورنہ صرف کھانے
پینے سے روزہ رکھنا بچوں اور بوڑھی عورتوں کا کام ہے[20]۔"

حج

استطاعت رکھنے والوں پر حج کی فرضیت اور اس کی رسوم پر روشنی ڈالنے کے بعد اسکی صوفیانہ تشریح کی ہے۔ اور اس ضمن میں مشائخ کے اقوال پیش کئے ہیں اور اپنی رائے یہ دی ہے کہ :

"پس حج دو قسم کا ہوتا ہے : ایک غیبت میں دوسرا حضور میں، جو شخص حرم مکہ میں بھی پہنچکر بھی غیبت کے اندر ہو، وہ ایسا ہی ہے جیسا اپنے گھر کے اندر ہو۔ اس لئے کہ کوئی غیبت دوسری سے بہتر نہیں۔ پس حج مشاہدہ حق کے ظہور کیلئے مجاہدہ ہے لیکن مجاہدہ مشاہدہ حق کے لئے علت نہیں بلکہ اس کا سبب ہے اور سبب کو معانی کی حقیقت میں کوئی زیادہ تاثیر نہیں ہوتی ۔ الغرض حج سے مقصود خانہ کعبہ کا دیدار نہیں بلکہ اس سے مقصود مشاہدہ حق ہے[۲۱]"

دعوت و تبلیغ

صوفیا کی گوشہ نشینی کو رہبانیت سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ داتا صاحب نے کئی جگہ اس کی وضاحت کی ہے کہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دنیاوی اغراض سے منہ موڑ لیا جائے اور جب صوفی کو کمال حاصل ہو جائے تو پھر خلق خدا کی اصلاح میں مشغول ہو جائے۔ خاموشی اور گفتگو کے باب میں دو نظریات پیش کئے ہیں۔ ایک یہ کہ صوفی کے لئے خاموشی سے کلام بہتر ہے۔ اور دوسرا یہ کہ کلام سے خاموشی بہتر ہے۔ داتا صاحب فرماتے ہیں۔

"میں علی بن عثمان الجلابی کہتا ہوں کہ کلام بھی دو قسم کا ہوتا ہے

اور سکوت کی بھی دو قسمیں ہیں - ایک کلام تو حق ہوتا ہے اور دوسرا
باطل - اسی طرح ایک سکوت تو مقصد کے حاصل ہونے کی وجہ
سے ہوتا ہے اور دوسرا سکوت غفلت کی وجہ سے - پس بولنے
یا خاموش رہنے کے وقت ہر شخص کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر
دیکھنا چاہیئے - اگر اس کا کلام حق ہے تو اس کا بولنا خاموشی سے بہتر
ہے اور اگر باطل ہے تو خاموشی ہی بہتر ہے "

آگے لکھتے ہیں :-

"پس طریقت کی طرف دعوت دینے والے اپنے بولنے میں
مامور اور مجبور ہوتے ہیں - اور کلام کے آداب یہ ہیں کہ بے امر
الٰہی نہ ہو - اور سوائے امر حق کے کچھ نہ کہے - خاموشی کے آداب
یہ ہیں کہ خاموش رہنے والا جاہل نہ ہو، جہالت پر راضی نہ رہے
اور غافل بھی نہ ہو" [۲۲]

سماع

داتا صاحب سماع کی اثر آفرینی کے قائل ہیں - ابتدائے حال میں سماع سے شغف رکھتے تھے
لیکن آخر میں اس سے پرہیز فرمانے لگے - انھوں نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور
بتایا ہے کہ -

"سننے کے لائق چیزوں میں سے دل کے لئے فوائد کے لحاظ
سے اور باطن کے لئے زوائد کے اعتبار سے اور کان کے
لئے لذت کی رو سے بہترین چیز اللہ تعالیٰ کا کلام ہے -
مسلمانوں کو قرآن پڑھنے اور سننے کا حکم ہے - قرآن کے

معجزات میں سے ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ اس کے پڑھنے اور
سننے سے طبیعت ملول نہیں ہوتی۔ اس سے رقت حاصل ہوتی ہے۔"

داتا صاحب شعر سننے کو مباح قرار دیتے ہیں لیکن شرط یہ رکھتے ہیں کہ کلام پاکیزہ اور خیالات نیک ہوں۔ خواہش نفس کے لئے سماع کرنے والوں کے بارے میں کہتے ہیں۔

"جاہل لوگوں نے حال میں مستغرق سماع کرنے والے صوفیوں
کو دیکھا تو کہنے لگے کہ سماع حلال ہے۔ اگر حلال نہ ہوتا تو
یہ صوفی لوگ نہ کرتے۔ چنانچہ ان جاہلوں نے ظاہر کو اختیار
کر لیا اور باطن کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ خود بھی ہلاک ہو
گئے اور ایک قوم کو بھی ہلاک کر دیا۔ یہ زمانہ کی بہت بڑی
آفت ہے۔"

مشائخ نے سماع کی اباحت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے داتا صاحب اسکی وضاحت فرماتے ہیں کہ :۔

"مشائخ صوفیا کی مراد اباحت فقہی نہیں کہ جس پر عمل کرنا نہ کرنا برابر
ہو بلکہ ان کی مراد اس سے وہ اباحت ہے جس سے اعمال میں فوائد
حاصل ہوں۔ ویسے مباح کے در پہ ہونا عوام کا کام ہے۔ سمجھدار
لوگ فوائد کو ملحوظ رکھتے ہیں۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں۔

" ایک دفعہ میں مرو میں تھا کہ ائمہ حدیث میں سے ایک مشہور
امام نے کہا "میں نے سماع کی اباحت میں ایک کتاب لکھی ہے۔"
میں نے کہا "یہ تو دین میں بڑی مصیبت ہوئی کیونکہ امام نے
ایک لہو کو جو تمام بدکاریوں کی اصل ہے حلال کر دیا ہے"۔

انہوں نے کہا کہ اگر تو اس کو حلال نہیں سمجھتا تو سنتا کیوں ہے ؟ میں نے کہا اس کی کئی وجوہ ہیں اور ان میں سے کسی ایک وجہ کو قطعی فیصلہ کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اگر اس کی تاثیر دل میں حلال ہے تو اس کا سماع بھی حلال ہے اور اگر حرام ہے تو سماع بھی حرام ہے اور اگر تاثیر مباح ہے تو سماع بھی مباح ہے ورنہ نہیں"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں "مرید کا سماع کے غلبہ میں ایسا حال ہونا چاہیئے کہ اس کا سماع بدکاروں کو بدکاری سے نجات دے مگر اس زمانہ میں گمراہوں کا ایک گروہ بدکاروں کے سماع میں حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم حق کی وجہ سے سماع کرتے ہیں۔ فاسق لوگ ان کی موافقت کرتے ہیں اور فسق و فجور میں زیادہ حریص ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود ہلاک ہو جاتے ہیں"۔ داتا صاحب کے زمانہ میں بعض لوگوں نے سماع کے ساتھ رقص بھی اختیار کر لیا تھا۔ لیکن داتا صاحب نے اپنے مریدوں کو اس کی مکمل ممانعت فرمائی ہے کہ "جاننا چاہیئے کہ شریعت اور طریقت میں رقص کی کوئی سند موجود نہیں رقص اچھا ہو تو لہو ہوتا ہے بُری طرح کیا جائے تو لغو ہوتا ہے۔ غرضیکہ یہ حرام محض ہے"۔ آخر میں سماع کے یہ آداب و شرائط مقرر کیے ہیں "سماع کو عادت نہ بنایا جائے۔ سماع کے وقت مرشد کی موجودگی ضروری ہے۔ وہاں عوام موجود نہ ہوں۔ قوال بھی شریعت کا احترام کرنے والا اور پابند دین ہو۔ دل دنیا کے دھندوں سے خالی اور طبیعت لہو و لعب سے متنفر ہو۔ میں علی بن عثمان جلابی اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ مبتدیوں کو سماع کی اجازت نہ دی جائے تاکہ ان کی طبیعت پریشان نہ ہو جائے کیونکہ اس میں بڑے خطرے اور خرابیاں ہیں۔ اس لیے کہ عورتیں چھتوں کے اوپر سے اور مکانوں سے ان کو سماع کی حالت میں دیکھتی ہیں اور اس سے سامعین پر سخت پردے پڑ جاتے ہیں۔ چاہیئے کہ جوانوں میں سے بھی کسی کو وہاں نہ بٹھائیں اس لیے کہ جاہل صوفیوں نے ان باتوں کو مذہب بنا لیا ہے اور سچائی کو درمیان سے اٹھا دیا ہے۔ میں ان باتوں سے جو اس قسم کی خرابیوں سے مجھ پر گزری ہیں استغفار کرتا ہوں"۔[۲۳]

*

ماخذ

****

باب ۱

۱۔ عبدالرحمن، صباح الدین۔ بزم صوفیہ۔ اعظم گڑھ۔ صفحہ ۱۔ ظہیر احمد شاہ "ظہیر المطلوب" اردو ترجمہ کشف المحجوب، لاہور میں سال پیدائش بغیر کسی ماخذ کے ۴۰۰ھ دیا گیا ہے۔ نیز اکرام آب کوثر لاہور صفحہ ۷۶
۲۔ جامی، نورالدین۔ نفحات الانس، کلکتہ ۱۸۵۹ء
۳۔ ابوالفضل، آئین اکبری، جلد ۳ صفحہ ۱۶۸
۴۔ ثمرات القدس (قلمی) بحوالہ "مآثر لاہور" جزو دوم صفحہ ۱۴
۵۔ دارا شکوہ، "سفینۃ الاولیا" اردو ترجمہ نفیس اکیڈمی کراچی۔ صفحہ ۲۰۹
۶۔ محمد شفیع مولوی، "مقالات دینی و علمی" لاہور۔ صفحہ ۱۹۳
۷۔ حبیب محمد، "سلطان محمود آف غزنین" دہلی (۱۹۵۱) صفحہ X
۸۔ الہجویری، "کشف المحجوب" نسخہ مولوی محمد شفیع، صفحہ ۱
۹۔ "سفینۃ الاولیا" ۲۰۹، ۲۱۰
۱۰۔ ایضاً ۲۱۰
۱۱۔ چشتی، مولوی نور احمد "تحقیقات چشتی" لاہور (۱۸۶۷ء) صفحہ ۱۴۷
۱۲۔ دریا بادی، عبدالماجد "تصوف اسلام" اعظم گڑھ (۱۹۴۶ء) صفحہ ۴۲۔ یزدانی، ایم اے مجید "گنج بخش بحیثیت عالم" لاہور (۱۹۶۸) ۲۹۔۳۰
۱۳۔ "تحقیقات چشتی" ۱۴۷
۱۴۔ کشف المحجوب ۶۹
۱۵۔ ایضاً ۷۱
۱۶۔ ایضاً ۷۲
۱۷۔ ایضاً ۷۳
۱۸۔ الہجویری، اردو ترجمہ کشف الاسرار۔ ملک شیر محمد اعوان، کالا باغ (۱۹۶۳) صفحہ ۳۶
۱۹۔ کشف المحجوب ۵۷
۲۰۔ کشف المحجوب ۲۰
۲۱۔ ایضاً ۴۱۵
۲۲۔ ایضاً ۸
۲۳۔ ایضاً ۱۱
۲۴۔ ایضاً ۲۵۵
۲۵۔ ایضاً ۲۸۵۔۶
۲۶۔ ایضاً ۴۱۲

۲۷۔ ایضاً ۴۳
۲۸۔ ایضاً ۴۶
۲۹۔ ایضاً ۴۹۔۵۰
۳۰۔ ایضاً ۳۸۴
۳۱۔ ایضاً ۱۵۹
۳۲۔ ایضاً ۲۷۴۔۵
۳۳۔ ایضاً ۳۶۶
۳۴۔ نکلسن، انگریزی ترجمہ کشف المحجوب ۴۲۲
۳۵۔ کشف المحجوب ۹۶
۳۶۔ ایضاً ۳۴۶۔۷
۳۷۔ ایضاً ۱۶
۳۸۔ ایضاً ۱۰۰
۳۹۔ ایضاً ۲۶۶
۴۰۔ سفینۃ الاولیا۔ ۲۱۰
۴۱۔ کشف المحجوب ۔۳۷۸
۴۲۔ ہاشمی سید فرید آبادی "مآثر لاہور" (۱۹۵۶) جزو دوم ۱۷
۴۳۔ آئین اکبری، جلد ۳۔ صفحہ ۱۷۸
۴۴۔ "مآثر لاہور" جزو دوم ۱۵
۴۵۔ "سفینۃ اولیا" نول کشور (۱۸۷۷ء) صفحہ ۱۶۵۔ اردو ترجمہ نفیس اکیڈمی نے سنہ ۴۶۴ھ کو ۴۵۴ھ بنا دیا ہے صفحہ ۲۱۰۔ نیز کشف المحجوب مقدمہ ۶
۴۶۔ حبیبی، عبدالحیٔ، اورنٹیل کالج میگزین لاہور (فروری ۱۹۶۰ء) صفحہ ۲۸
۴۷۔ مفتی غلام سرور لاہوری "خزینۃ الاصفیا" جلد ۲۔ صفحہ ۲۳۴
۴۸۔ مقالات دینی و علمی حصہ اول صفحہ ۱۹۲
۴۹۔ تحقیقات چشتی۔ ۱۴۰
۵۰۔ مقالات دینی و علمی ۱۹۲
۵۱۔ عبدالحی سید "نزہت الخواطر" اردو ترجمہ مقبول اکیڈمی لاہور، جلد اول ۱۵۲
۵۲۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ۲۔ صفحہ ۹۲۷
۵۳۔ عبدالماجد دریابادی "تصوف اسلام" صفحہ ۴۹۔ لکھتے ہیں کہ دوسرے قرینے بھی اسی کی تائید میں ہیں۔
۵۴۔ بزم صوفیہ ۸
۵۵۔ آب کوثر ۷۷
۵۶۔ نکلسن، ترجمہ کشف المحجوب صفحات XI - X
۵۷۔ مقالات علمی اول ۳-۱۹۲
۵۸۔ سالک، علم الدین "گنج بخش" ۱۶ تا ۱۸
۵۹۔ اورنٹیل کالج میگزین (فروری ۱۹۶۰) ۲۷ تا ۴۰
۶۰۔ ایضاً ۳۳

۶۱۔ ایضاً ۳۴
۶۲۔ ایضاً ۳۵
۶۳۔ ایضاً ۳۵
۶۴۔ ایضاً ۳۶
۶۵۔ ایضاً ۳۸
۶۶۔ نکلسن ترجمہ کشف المحجوب X - XI
۶۷۔ گنج بخش بحیثیت عالم۔ ۴۰ تا ۴۵
۶۸۔ کشف المحجوب مملوکہ مولوی محمد شفیع مرحوم جسے ان کے فرزند احمد ربانی نے شائع کر دیا ہے۔

باب ۲

۱۔ تحقیقات چشتی ۶-۱۴۵
۲۔ فیروزالدین مولوی "بیان المطلوب" ترجمہ کشف المحجوب ۱۱
۳۔ تحقیقات چشتی ۱۴۱
۴۔ ایضاً ۱۴۱
۵۔ ایضاً ۱۴۲
۶۔ ایضاً ۱۴۲، ۱۴۴
۷۔ ایضاً ۱۴۷

باب ۳

۱۔ جیسے داتا صاحب کی اپنی نوشتہ ہے۔ ابو سعید عبدالحی الضحاک گردیزی کی "زین الاخبار" کے بیشتر اجزا۔ ابوالفضل بیہقی (۳۸۵ھ تا ۴۷۰ھ) کی تاریخ مسعودی کی کم از کم پچیس جلدیں۔ ظہیرالدین علی بن زید البیہقی (۴۹۰ھ تا ۵۶۵ھ) کی "مشارب التجارب و غرائب الغرائب" وغیرہ۔
۲۔ بٹالوی۔ سبحان رائے "خلاصۃ التواریخ" اردو ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی لاہور (۱۹۶۶ء) صفحہ ۱۰۶۔
۳۔ مقالات علمی۔ اول۔ ۹۴-۱۹۳
۴۔ "رسالہ ابدالیہ" بحوالہ نکلسن دیباچہ X
۵۔ آثر لاہور۔ جزو دوم۔ ۲۰، ۲۲
۶۔ اورنٹیل کالج میگزین (فروری ۱۹۶۰ء) صفحات ۳۱-۳۰
۷۔ کشف المحجوب ۲۵۶
۸۔ ایضاً ۴۷
۹۔ ایضاً ۵۴
۱۰۔ کشف المحجوب ۱۷۳
۱۱۔ مقالات علمی اول ۱۹۴
۱۲۔ آثر لاہور جزو دوم ۲۷
۱۳۔ سجزی، امیر حسن "فوائد الفواد" ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور (۱۹۶۶ء) صفحہ ۵۷۔
۱۴۔ محدث، شیخ عبدالحق، دہلوی "اخبار الاخیار" اردو ترجمہ لطیف ملک لاہور (۱۹۷۱) ۲۱۳

۱۵۔ ایضاً ۱۰۹
۱۶۔ مآثر لاہور جزو دوم ۲۴
۱۷۔ تصوف اسلام۔ ۵۱-۱۵۰
۱۸۔ "مآثر لاہور" جزو دوم ۲۵
۱۹۔ کشف المحجوب ۱۷۳
۲۰۔ مآثر لاہور جزو دوم ۲۵
۲۱۔ آئین اکبری۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۶۸۔ خزینۃ الاصفیا" جلد ۲۔ صفحہ ۲۵۰۔ سید محمد لطیف نے تاریخ لاہور (انگریزی) میں ماخذ بتائے بغیر تاریخ ۴۳۱ھ لکھی ہے
۲۲۔ "سفینۃ الاولیا" ۱۲۸۔ مقالات علمی اول ۲۱۵
۲۳۔ "خزینۃ الاصفیا"۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۵۳
۲۴۔ تحقیقات چشتی۔ صفحہ ۱۲۸۔ لیکن چشتی نے اگلی سے پہلے صفحہ پر لاہور میں ورود کا سن ۵۳۵ھ لکھا ہے۔
۲۵۔ اورنٹیل کالج میگزین (فروری ۱۹۶۰) ۳۹ تا ۴۱
۲۶۔ کشف المحجوب ۹۶۔ بعض نسخوں میں " اندر دیار ہند" کے آگے "در بلدۂ لہور کہ از مضافات ملتان است" کا اضافہ ملتا ہے بلکس ترجمہ کشف المحجوب صفحہ ۹۱۔ روسی نسخے میں بھی لاہور کا ذکر متن میں نہیں حاشیہ میں کیا گیا ہے صفحہ ۱۱
۲۷۔ "تصوف اسلام" صفحہ ۴۹
۲۸۔ اظہر قاضی مبارکپوری "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" ندوۃ المصنفین دہلی (۱۹۶۷) ۲۵۳
۲۹۔ ندوی، ریاست علی "عہد اسلامی کا ہندوستان" ادارۃ المصنفین، پٹنہ (۱۹۵۰ء) ۹۹
۳۰۔ آب کوثر ۷۵
۳۱۔ تحقیقات چشتی۔ ۸-۱۰۷۔ "خزینۃ الاصفیا" جلد ۲ صفحہ ۲۳۰
۳۲۔ مآثر لاہور جزو دوم ۱۰۹
۳۳۔ سفینۃ الاولیا ۲۱۰

باب ۴

۱۔ "فتوح البلدان"۔ "معجم البلدان" ترجمہ "انساب العرب" بحوالہ "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" صفحات ۲۵ تا ۲۷
۲۔ ایضاً ۲۴۵
۳۔ مآثر لاہور جزو اول ۱۵
۴۔ البیرونی، ابو ریحان، کتاب الہند انگریزی ترجمہ جلد اول ۲۷۴۔ فرشتہ، اردو ترجمہ لاہور ۴۱۲۔ مآثر لاہور جزو اول صفحات ۱۶-۱۷
۵۔ سلطان محمود آف غزنین ۲۴
۶۔ کتاب الہند جلد اول ۲۷۶، ۲۷۴
۷۔ فخر مدبر "آداب الحرب والشجاعۃ" بحوالہ مآثر لاہور جزو اول ۱۵۔ دوم ۱۷۳
۸۔ محب الحسن "کشمیر سلاطین کے عہد میں" اعظم گڑھ (۱۹۶۹) صفحات ۴۰ تا ۴۲
۹۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۲۱۔ کتاب الہند جلد اول ۱۵۶
۱۰۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۲۲۲

۱۱- سلطان محمود آف غزنین ۳۴
۱۲- ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں - ۱۰۰
۱۳- سلطان محمود آف غزنین ۴۷-۴۶
۱۴- مآثر لاہور جز و اول ۲۵
۱۵- لاہور، لطیف حاشیہ صفحہ ۲۲
۱۶- وتسیانا "کام شاستر" انگریزی ترجمہ سر رچرڈ برٹن - لندن (۱۹۶۳) ۵۸
۱۷- کتاب الہند- جلد اول ۳۴۸
۱۸- خلاصۃ التواریخ، بٹالوی ۱۰۵
۱۹- ٹاڈ کرنل" اینلز اینڈ اینٹیکز آف راجستھان لندن (۱۹۱۴) جلد اول ۱۷۶- نیز لاہور لطیف صفحہ ۴۰
۲۰- تھارنٹن ٹی- ایچ" اے بریف اکاؤنٹ آف ہسٹری اینڈ اینٹیکز آف لاہور (۱۸۷۳ء) ۱۰
۲۱- البلاذری (متوفی ۲۷۹ھ/ ۸۹۲ء) بحوالہ ہسٹری آف انڈیا- ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن، لندن (۱۸۶۷ء) جلد اول ۱۱۶
۲۲- نامعلوم، "حدود العالم" (لندن ۱۹۳۷) ۴۱۴
۲۳- یاقوت، معجم البلدان بحوالہ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۲۴۵
۲۴- خان ولی اللہ خان" دی اوریجن آف لاہور" پاکستان ٹائمز لاہور دس سالہ نمبر
۲۵- کتاب الہند جلد اول- ۲۷۵-۲۷۶
۲۶- مآثر لاہور جز و اول ۲۰
۲۷- خان ولی اللہ خان" دی اوریجن آف لاہور"
۲۸- پراشر سی ایل" لاہور شہر" (پنجابی) ۲۶
۲۹- مآثر لاہور جز و اول ۲۲
۳۰- لاہور از لطیف ۳۹۷ تا ۴۰۰
۳۱- شفیع،" آداب الحرب والشجاعۃ" اورنٹیل کالج میگزین لاہور (نومبر ۱۹۳۷ء) - اصل کتاب ابھی تک نہیں چھپی- نیز مآثر لاہور جز و دوم صفحات ۱۷۲ تا ۱۷۴
۳۲- کشف المحجوب نکلسن ۹۱
۳۳- کشف المحجوب ۹۶
۳۴- سالک" علم الدین" گنج بخش" بحوالہ یزدانی ۳۲
۳۵- ۳۹۹ھ/ ۹-۱۰۰۸ء میں قلعہ نگر کوٹ سے ۷ کروڑ درہم کے سکے، ستر ہزار من سونا چاندی اور سونا سے دو کروڑ دینار کا مال ہاتھ لگا۔ رے پر قبضہ سے ۸ لاکھ دینار کے سکوں کے علاوہ تیس ہزار دینار کے طلائی و نقرئی برتن ہاتھ لگے بحوالہ باسورتھ" دی غزنویڈز" صفحہ ۷۸۔ نیز مرنے کے دو دن پہلے سارے خزائن کا ڈھیر لگوا کر دیکھا اور رو پڑا۔ اگلے دن ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قطاریں لگوا کر دیکھیں - فرشتہ ۳۱ ۵
۳۶- غزنوی سلاطین کے عزل و نصب کی یہ مختصر داستان" فرشتہ"۔" سلطان محمود آف غزنین"۔" دی غزنویڈ" "مآثر محمود" اور" نزہت الخواطر" سے مرتب کی گئی ہے۔ عزل و نصب کی تاریخوں کے لیے کلیتاً انحصار" دی غزنویڈز" پر کیا گیا ہے۔ نیز مردم شماری رپورٹ (۱۹۶۱) انگریزی، ڈسٹرکٹ راولپنڈی I صفحہ ۹ -
۳۷- سلطان محمود آف غزنین ۴۶-۴۷
۳۸- خلاصۃ التواریخ- ۱۰۵
۳۹- مآثر لاہور جز و اول- ۲۱

۴۰۔ لاہور، لطیف ۳۹۷-۳۹۸
۴۱۔ مآثر لاہور جز و اول ۲۶،۲۵
۴۲۔ ایضاً ۲۸ تا ۳۱
۴۳۔ ایضاً ۳۱ تا ۴۳، نیز سلطان محمود آف غزنین ۹۵
۴۴۔ "دی غزنویڈز" ۷۶
۴۵۔ مآثر لاہور جز و اول ۳۱ تا ۳۹۔ سلطان محمود آف غزنین ۹۶
۴۶۔ فرشتہ ۱۸۱-۱۸۲ نیز سلطان محمود آف غزنین ۱۰۳
۴۷۔ فرشتہ ۱۸۵۔ سلطان محمود غزنوی ۱۰۴
۴۸۔ سلطان محمود آف غزنین ۱۰۴۔ مآثر لاہور جز و اول ۵۶
۴۹۔ ایضاً ۱۰۵-۱۰۶۔ " " " ۷۵ تا ۷۶
۵۰۔ فرشتہ ۵-۱۹۴۔ مآثر لاہور جز و اول ۷۷
۵۱۔ ایضاً ۱۹۶۔ ایضاً ۷۸
۵۲۔ مآثر لاہور جز و اول ۷۹ تا ۱۰۵
۵۳۔ " " " " " " ۲۰۷
۵۴۔ " " " جز و دوم ۷۵
۵۵۔ " " " " " ۷۶ تا ۹۶
۵۶۔ " " " " " ۱۳۵
۵۷۔ " " " " " جز و اول ۱۲۰ تا ۱۲۸۔ جز و دوم ۱۳۸ تا ۱۴۰
۵۸۔ " " " جز و دوم ۱۴۴
۵۹ " " " جز و اول ۲۲،۱۹۰ تا ۲۰۱

باب ۵

۱۔ کشف المحجوب ۸-۲۵۷
۲۔ " " ۲۸۶
۳۔ کتاب الہند۔ جلد اوّل۔ پیش لفظ LX
۴۔ کشف المحجوب ۳۴۰
۵۔ " " ۴۶۵
۶۔ " " ۴۵۵
۷۔ البیرونی، کتاب الہند جلد اول ۲۶۱-۲۶۰
۸۔ مآثر لاہور جز و دوم ۹
۹۔ مآثر لاہور جز و اول ۱۶
۱۰۔ تحقیقات چشتی ۱۹۸
۱۱۔ دی غزنویڈز، صفحات ۷۸-۱۱۴۔
۱۲۔ کشف المحجوب ۳۸۷
۱۳۔ " " ۲۶۶

۱۴- داراشکوہ۔ سفینۃ الاولیا ۲۱۰
۱۵- کشف المحجوب ۴۰۶
۱۶- " " ۵۴
۱۷- " " ۳۸۳
۱۸- " " ۳۸۰
۱۹- " " ۸۳ - ۲۸۲
۲۰- تحقیقات چشتی ۱۳۹
۲۱- تاثر لاہور جز دوم ۲۳
۲۲- کشف الاسرار اردو ترجمہ ملک شیر محمد اعوان۔ کالاباغ ۱۹۶۳ صفحات ۴۰-۳۹

باب ۶

۱- ایم ناظم "دی لائف اینڈ ٹائمز آف سلطان محمود آف غزنہ (کیمبرج ۱۹۳۱ء) ۹ - ۱۵۶
۲- چہار مقالہ - براؤن - نظرثانی شدہ ترجمہ ۵۳
۳- بیہقی ۱/۲۱ - ۵۳۹ - بحوالہ بوسورتھ ۱۳۷
۴- بوسورتھ ۶۲
۵- چہار مقالہ طبع لاہور صفحہ ۲۳ - مولانا ہاشمی کے نزدیک صاحب چہار مقالہ نے اپنے ایرانی سسرال اور شیعی روایات کے زیر اثر محمود پر چھپ کر حملے کیے ہیں۔ تاثر لاہور جز واول صفحہ ۵۸ حاشیہ
۶- باسورتھ ۹۶
۷- " " ۱۲۹
۸- " " ۱۳۸
۹- " " ۷۶ اور حاشیہ ۵۹ - صفحہ ۲۷۶ - نیز حبیب ۲۵
۱۰- حبیب - دی سلطان محمود آف غزنین ۸۵
۱۱- " " " " " ۲۷
۱۲- البیرونی انڈیا - جلد اول ۲۴-۲۶
۱۳- باسورتھ ۷۸ - ۱۰۲
۱۴- " ۷۹
۱۵- " ۱۱۷
۱۶- تاثر لاہور جز واول ۹-۵۳۴ بوسورتھ ۱۱۰-۸۹ م
۱۷- پروفیسر سی وی دید یہ ممبئی یونیورسٹی اور پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی کلکتہ یونیورسٹی - بحوالہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک - مرتبہ صباح الدین عبدالرحمٰن اعظم گڑھ ۱۹۵۸ صفحات ۴۸-۴۷ - نیز لطیف، ہسٹری آف لاہور - صفحات ۳۹۷ تا ۴۰۱ - نیز باسورتھ ۴۴
۱۸- کشف المحجوب ۱۴۰
۱۹- فرشتہ ۷۰-۱۵۷
۲۰- بیہقی ۸ - ۶۳۶ بحوالہ حبیب دیباچہ VI تا IX
۲۱- کشف المحجوب ۲۱۳

۲۲ - ″ ″ — ۳۴۰

باب ۷

۱ - مولوی شفیع - مقالات علمی حصہ اوّل ۱۹۹

۲ - آقائے حبیبی، ارمغان علمی لاہور ۱۹۵۵، صفحہ ۴۳

۳ - مآثر لاہور - جزو دوم ۵۰

۴ - درر نظامی - مرتبہ شیخ علی محمود جاندار - قلمی نسخہ - بحوالہ مولانا دریابادی تصوف اسلام صفحہ ۵۲

۵ - ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۹،

۶ - بزم صوفیہ - صفحہ ۱۰

۷ - نفحات الانس ۳۵۸

۸ - سفینۃ الاولیاء ۴۱۰

۹ - کشف المحجوب ۸۰ - ۳۷۹

۱۰ - ″ ″ ۳۸۳

۱۱ - نکلسن، ترجمہ - پیش لفظ XII

۱۲ - ایم۔ اے مجید یزدانی، گنج بخش بحیثیت عالم - صفحہ ۳۳ - یزدانی صاحب نے اپنا ما...
نہیں کیا۔ تاہم گلزار ابرار کے ترجمہ اذکار ابرار میں داتا صاحب کا مزار غلط طور پر غزنی میں بتایا گیا ہے کشف المحجوب

۱۳ - مقالات علمی اوّل ۱۸۸

۱۴ - کشف المحجوب ۱۶۴

۱۵ - شبلی نعمانی - الغزالی - صفحہ ۴

۱۶ - کشف المحجوب ۳۳۳

۱۷ - بزم صوفیہ صفحہ ۷ حاشیہ ۱

۱۸ - مآثر لاہور - جزو دوم ۵۲

۱۹ - کشف المحجوب صفحہ ۱

۲۰ - ″ ″ ″ ۹-۱۰

۲۱ - ″ ″ ″ ۳۰

۲۲ - ″ ″ ۱۲۰ - نیز دیکھیے نکلسن کا اختلافی حاشیہ صفحہ ۱۱۴ - یہ اس بات کا مزید ثبوت
کتاب زبانی لکھی گئی۔

۲۳ - کشف المحجوب ″ ۷

۲۴ - تحقیقات چشتی ۱۲۵

۲۵ - کشف المحجوب صفحہ ۴

۲۶ - ڈاکٹر مہدی بیانی مقالہ قدیم ترین نمونہ نثر فارسی موجود - ارمغان علمی صفحہ ۲۲۳ نیز آقائے حبیبی د...
صفحہ ۵۱

۲۷ - کشف المحجوب ۲۸۶

۲۸ - ″ ″ ۴۳۲-۳

۲۹ - ″ ″ ۴۶۰

۳۰۔ 〃 〃 ۱-۲
۳۱۔ 〃 〃 ۲
۳۲۔ 〃 〃 ۳۷۶
۳۳۔ عبدالماجد دریابادی، تصوف اسلام ۴-۵۳
۳۴۔ کشف المحجوب ۷
۳۵۔ 〃 〃 ۵۴۔
۳۶۔ کشف المحجوب ۳۰۵۔ مولوی محمد شفیع مرحوم نے بتایا ہے کہ قریباً اسی نام کی کتاب داتا صاحب سے دو صدی سے زیادہ پہلے ابوعبداللہ الحارث بن اسد المحاسبیؒ نے لکھی جو چھپ چکی ہے۔ مقدمہ کشف المحجوب صفحہ ۱۰

باب ۸

۱۔ کشف المحجوب ۸۰-۳۷۹
۲۔ 〃 〃 ۳۸۷
۳۔ 〃 〃 ۳۸۷
۴۔ "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" کا پہلا ایڈیشن ولندیزی مستشرق ایم۔ جے۔ ڈی غوئے M.J.De Goeje نے ۱۸۷۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ ڈاکٹر سپرنگر ہندوستان سے لے گئے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں ڈی غوئے نے بعض دوسرے نسخوں سے مقابلہ کرکے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔ ۱۹۶۲ء میں دہلی یونیورسٹی میں ادبیات عربی کے پروفیسر جناب خورشید احمد فارق نے "اسلامی دنیا: دسویں صدی عیسوی میں" کے نام سے احسن التقاسیم کا خلاصہ اردو میں کیا جسے ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔ مقدسی کے تمام حوالے اسی اردو ایڈیشن کے دیئے گئے ہیں
۵۔ کشف المحجوب ۸-۴۷
۶۔ مقدسی ۱۷۲
۷۔ 〃 ۱۷۳
۸۔ کشف ۲۷۴
۹۔ مقدسی ۵۱--۱۵۰
۱۰۔ مقدسی ۸-۱۴۷
۱۱۔ کشف المحجوب ۴۵۶
۱۲۔ مقدسی ۵۰-۱۴۸
۱۳۔ کشف المحجوب ۸۱-۱۸۰
۱۴۔ مقدسی ۱۵۲
۱۵۔ 〃 ۲-۱۶۱
۱۶۔ کشف المحجوب ۱۸۱
۱۷۔ مقدسی ۲۳-۱۲۲
۱۸۔ مقدسی ۱۲۸ تا ۱۳۲-۱۷۲
۱۹۔ کشف ۵۴
۲۰۔ 〃 ۴۲۸
۲۱۔ 〃 ۱۸۰

۲۲۔ مقدسی ۳-۱۹۲، ۱۹۶، ۲۵۹
۲۳۔ 〃 ۱۷۶، ۱۸۷
۲۴۔ کشف المحجوب ۱۵۹
۲۵۔ مقدسی ۱۰-۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۶، ۲۲۲-۲۴۔
۲۶۔ کشف المحجوب ۸۱-۱۸۰
۲۷۔ مقدسی ۸-۲۲۷، ۶-۲۲۵، ۲۴۷
۲۸۔ کشف المحجوب ۱۸۰
۲۹۔ مقدسی ۲۴۸، ۲۵۲، ۲۵۷، ۹-۲۵۸
۳۰۔ مقالات علمی اول ۱۸۶
۳۱۔ مقدسی ۷۱-۷۱، ۷۹، ۸۱-۸۰
۳۲۔ کشف المحجوب ۱۵۹
۳۳۔ 〃 〃 ۱۶۰ھ
۳۴۔ 〃 〃 ۲۸۴
۳۵۔ 〃 〃 ۷-۳۸۶
۳۶۔ 〃 〃 ۷-۴۰۶
۳۷۔ مقدسی ۴۰-۳۸، ۹-۴۷
۳۸۔ کشف المحجوب ۴۶۵
۳۹۔ آثار لاہور جزو دوم ۴۰-۳۹
۴۰۔ مقدسی ۶-۱۲۵، معجم البلدان جلد اول ۳۱-۱۳۰

باب ۹

۱۔ کشف المحجوب ۶۷، ۷۱، ۷۲
۲۔ 〃 〃 ۱۶۸
۳۔ 〃 〃 ۹-۱۶۸
۴۔ 〃 〃 ۱۶۹۔ سفینۃ الاولیا ۲۰۴، تذکرۃ الاولیا عطار ۱۰-۳۰۸۔
۵۔ 〃 〃 ۷۰-۱۶۹، فرشتہ ۶۰-۷، ۱۵۷، سفینۃ الاولیا ۱۰۶
۶۔ 〃 〃 ۱۷۱، سفینۃ الاولیا ۲۰۵
۷۔ 〃 〃 ۲-۱۷۱، ۲۵۶، سفینۃ الاولیا ۸-۲۰۷
۸۔ 〃 〃 ۴-۱۷۳، ۲۴۸، ۵۰، مقالات علمی اول ۱۸۶، مقدسی، احسن التقاسیم ۸-۷، اورنٹیل کالج میگزین فروری ۶۰ء صفحہ ۳۲۔
۹۔ کشف المحجوب ۱۷۴، ۲۲۵، ۸-۱۵۷، ۱۷۰، ۲۲۴، ۳۲۲، ۳۶۷، رسالہ اور صاحب پر تبصرہ کے لیے دیکھئے تصوف اسلام، عبدالماجد دریابادی صفحات ۸۰ تا ۹۹۔ اورنٹیل کالج میگزین ۶۰۔ ۳۳-۳۴۔
۱۰۔ کشف المحجوب ۵-۱۷۴، ۸-۱۵۷، ۲۰-۲۱۹، ۲۴۵، ۴۷۰، اورنٹیل کالج میگزین فروری ۱۹۶۰ء صفحہ ۳۶

۱۱۔ کشف المحجوب ۶-۱۷۵، ۲۲۰، ۸-۱۵۷، ۲۵۵، ۳۷۸، سفینۃ الاولیا ۱۰۸، خزینۃ الاصفیا جلد ۲ صفحہ ۸

۱۲۔ کشف المحجوب ۷۸-۱۷۶

۱۳۔ ″ ″ ۱۷۹ تا ۱۸۲

۱۴۔ باسورتھ، دی غزنویڈز ۱۷۹

باب ۱۰

۱۔ کشف المحجوب، نکلسن دیباچہ XII - XIII

۲۔ کشف المحجوب ۱۱

۳۔ ایضاً ۱۱-۱۲

۴۔ ایضاً ۱۲

۵۔ ایضاً ۱۲-۱۴

۶۔ ایضاً ۱۴-۱۵

۷۔ ایضاً ۱۶

۸۔ ایضاً ۱۴۷

۹۔ ایضاً ۲۸۴

۱۰۔ ایضاً ۴۳۳

۱۱۔ ایضاً ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۶

۱۲۔ ایضاً ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۴، ۳۷۰

۱۳۔ ایضاً ۳۱۲، ۳۱۵

۱۴۔ ایضاً ۳۱۷، ۳۱۸

۱۵۔ ایضاً ۳۲۱، ۳۲۳، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۳

۱۶۔ عبدالقادر، علی حسن "جنید بغداد" ترجمہ محمد کاظم (لاہور ۱۹۶۷ء)

۱۷۔ کشف المحجوب ۱۷۳ "تحقیقاتِ چشتی" ۱۴۷۔ "جنید بغداد" ۱۱۰

۱۸۔ کشف المحجوب ۳۳۴ تا ۳۴۴

۱۹۔ ایضاً ۳۴۵ تا ۳۴۸

۲۰۔ ایضاً ۳۵۴ تا ۳۶۰

۲۱۔ ایضاً ۳۶۰ تا ۳۶۴

۲۲۔ ایضاً ۴۰۲ - ۴۰۳

۲۳۔ ایضاً ۴۴۰ تا ۴۸۱

کتابیات

****

اردو

* اطہر، قاضی مبارکپوری "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" ندوۃ المصنفین۔ دہلی (۱۹۶۷ء)
* اکرام، شیخ محمد "آبِ کوثر" فیروز سنز لاہور، طبع ششم ۱۹۶۶ء
* الہجویری، ابوالحسن علی بن عثمان "کشف المحجوب" اردو ترجمہ ملک شیر خان اعوان، دار التالیفات کالا باغ ۱۹۶۳ء
* اورینٹل کالج میگزین لاہور۔ (فروری ۱۹۶۰ء)
* برنی، ضیاء الدین، "تاریخ فیروز شاہی" ترجمہ ڈاکٹر سید معین الحق، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۶۹ء
* براؤن سی ایل۔ "لاہور شہر" (ناشر و سال اشاعت نامعلوم)
* پیام شاہجہان پوری "آفتاب ہجویر" سراج الدین اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۳ء
* چشتی، مولوی نور احمد، "تحقیقات چشتی" لاہور ۱۸۶۷ء
* داراشکوہ، "سفینۃ الاولیاء" ترجمہ محمد علی لطفی۔ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۹ء
* سالک، علم الدین "رسالہ گنج بخش"
* سبحان رائے بٹالوی، "خلاصۃ التواریخ" ترجمہ ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، مرکزی اردو بورڈ لاہور ۱۹۶۶ء
* سجزی، امیر حسن علاء "فوائد الفواد" ملک سراج الدین اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۶ء
* شبلی نعمانی، "الغزالی"۔ شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور (سن نامعلوم)
* شفیع، مولوی محمد "مقالات، دینی و علمی" لاہور
* صباح الدین عبدالرحمن، سید "بزم صوفیہ" دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء
صباح الدین عبدالرحمن سید "ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" دار المصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۵۸ء
* عبداللہ، سید، "ارمغان علمی"، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۵۵ء
* عبدالماجد (دریا بادی)، "تصوف اسلام" دار المصنفین اعظم گڑھ۔ طبع سوم ۱۹۴۷ء
* عبدالحی، سید "نزہۃ الخواطر" ترجمہ ابو یحییٰ امام نوشہروی، (۴ جلدیں) مقبول اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۵ء
* عبدالحق محدث دہلوی "اخبار الاخیار" ترجمہ لطیف ملک، لاہور ۱۹۶۷ء
* عبدالقادر، علی حسن "جنید بغداد" ترجمہ محمد کاظم، لاہور ۱۹۶۷ء
* فاروقی، خورشید احمد "اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں" (خلاصہ احسن التقاسیم)، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۲ء
* فرشتہ، محمد قاسم، "تاریخ فرشتہ" ترجمہ عبدالحی خواجہ، غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء
* محب الحسن "کشمیر سلاطین کے عہد میں" ترجمہ علی حماد عباسی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۷ء
* ندوی، ریاست علی "اسلامی عہد کا ہندوستان" ادارۃ المصنفین، پٹنہ ۱۹۵۰ء

* ہاشمی، سید، "تاثر لاہور" ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۵۶ء
* یزدانی، ایم۔ اے۔ مجید، "گنج بخش بحیثیت عالم" ادارہ علوم اسلامیہ لاہور ۱۹۶۸

فارسی

* ابوالفضل علامی، "آئین اکبری" نول کشور ۱۸۸۲ء
* الہجویری، علی بن عثمان، "کشف المحجوب" منقولہ خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی۔ مقدمہ وتعارف مولوی محمد شفیع ۱۹۶۸ء
* جامی، نورالدین، "نفحات الانس" کلکتہ ۱۸۵۹ء
* داراشکوہ، "سفینۃ الاولیا"۔ نول کشور ۱۸۷۲ء
* مفتی غلام سرور لاہوری، "خزینۃ الاصفیا" نول کشور کانپور ۱۹۱۴ء

English.

Bosworth, Clifford E., The Ghaznavids (Edinburh 1963)
Habib, Mohammad., Sultan Mahmud of Ghaznin (Delhi 1951)
Latif, Syed Mohammad, Lahore (Lahore 1956)
Nazim, M., The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna (Cambridge 1931)
Nicholson, Reynold A., Kashf al-Mahjub, English translation (London 1959)
Sachau, Edward C., al-Biruni's India, English translation (Lahore 1962)

*

مخدوم علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی
الغزنوی ثم الہجویری المعروف بہ

داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ
اور
اُن کا عہد

✿

خالد محمود

✿

مقبول اکیڈمی، ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور